مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلہ
المنار
یو۔ ایس۔ اے
جلد نمبر 2
شمارہ نمبر 1
جولائی 2015

مجلس ادارت

پتہ برائے خط وکتابت

editorAlmanar@gmail.com

Click Here to visit TICAA USA Website

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس شمارے میں

تبرّکات	القران، الحدیث
ملفوظات	حضرت مسیح موعود علیہ السلام
تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے بعض اساتذہ کا تذکرہ	محمود مجیب اصغر
افسانہ: گلی	شاہین کاظمی
فراز عرش سے ٹوٹا ہوا تارا۔۔۔ ساغر صدیقی۔۔۔	عبد الہادی ناصر
تصنیفات غالب	مالک رام
تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن یو۔ ایس۔ اے تعلیمی وظائف کا اجراء	ادارہ
یاد آئی جب اُن کی گھٹا کی طرح ذکر ان کا چلا نم ہوا کی طرح	داؤد طاہر
پروفیسر حبیب الرحمان ساحرؔ وفات پا گئے!!!	ادارہ
شاعری۔ محمد خالد، ڈاکٹر ابرار احمد، جمیل الرحمان، اکرم محمود اور عاصم صحرائی	
Book Extract: *Islam in the African American Experience* by Richard Brent Turner	Safir Rammah

لٰکِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ مِنۡہُمۡ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ وَ الۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ الۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِکَ سَنُؤۡتِیۡہِمۡ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۱۶۳﴾

لیکن اُن (یہود) میں سے جو پختہ علم والے اور (سچے) مومن ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور اس پر بھی جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے اور اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لانے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہم ضرور ایک بہت بڑا اجر عطا کریں گے۔ [4:163]

اولاد کا بھی اکرام کرو اور انہیں بہترین تربیت دو

عن انس بن مالک یحدث عن رسول اللہ ﷺ قال اکرموا اولادکم واحسنوا ادبھم (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ اپنی اولاد کی بھی عزت کیا کرو اور ان کی تربیت کو بہترین قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرو۔

ملفوظات

اِس زمانہ کا جہاد

حضرت مسیح موعود علیہ السلام

اگر تم نے جنگوں سے فتح پانی ہوتی اور تمہارے لیے لڑائیاں کرنا مقدر تھا تو خدا تعالیٰ تم کو ہتھیار دیتا۔ توپ و تفنگ کے کام میں تم کو سب سے بڑھ کر چالاکی اور ہوشیاری دی جاتی۔ مگر خدا تعالیٰ کا فعل ظاہر کر رہا ہے کہ تم کو یہ طاقتیں نہیں دی گئیں بلکہ سلطانِ روم کو بھی ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ جرمن یا انگلستان وغیرہ سے ممالک سے بنواتا ہے اور آلاتِ حرب عیسائیوں سے خرید کرتا ہے۔ چونکہ اس زمانہ کے واسطے یہ مقدّر نہ تھا کہ مسلمان جنگ کریں اس واسطے خدا تعالیٰ نے ایک اور راہ اختیار کی۔ ہاں صلاح الدین وغیرہ بادشاہوں کے وقت ان باتوں کی ضرورت تھی۔ تب خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کی اور کفّار پر اُن کو فتح دی۔ مگر اب تو مذہب کے واسطے کوئی شخص جنگ نہیں کرتا۔ اب تو لاکھ لاکھ پرچہ اسلام کے بر خلاف نکلتا ہے۔ جیسا ہتھیار مخالف کا ہے ویسا ہی ہتھیار ہم کو بھی تیار کرنا چاہیے۔ یہی حکم خداوندی ہے۔ اب اگر کوئی خونی مہدی آجائے اور لوگوں کے سر کاٹنے لگے تو یہ بے فائدہ ہو گا... مارنے سے کسی کی تشفّی نہیں ہو سکتی۔ سر کاٹنے سے دلوں کے شبہات دور نہیں ہو سکتے۔ خدا تعالیٰ کا مذہب جبر کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام نے پہلے بھی کبھی پیش دستی نہیں کی۔ جب بہت ظلم صحابہؓ پر ہوا تو دشمنوں کو دفع کرنے کے واسطے جہاد کیا گیا تھا۔ خدا تعالیٰ کی حکمت کے مطابق کسی کی دانائی نہیں۔ ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اس معاملہ میں دعا کرے اور دیکھے کہ اس وقت اسلام کی تائید کی ضرورت ہے یا نہیں۔ جسم پر غالب آنا کوئی شئے نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دلوں کو فتح کیا جائے۔"

(ملفوظات جلد چہارم، ۴۹۷، ایڈیشن ۲۰۰۳ء مطبوعہ ربوہ)

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے بعض اساتذہ کا تذکرہ

محمود مجیب اصغر

بچوں کی ایک کلاس میں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے خواہش فرمائی تھی کہ ربوہ کے اساتذہ کا ذکر ہونا چاہئے۔ خاکسار کو تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں دو سال پڑھنے کا شرف حاصل ہوا اور خاکسار نے یہیں سے ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) کر کے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں داخلہ لیا جہاں سے سول انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی۔ اگر خاکسار کو اس کالج میں پڑھنے کا موقع نہ ملتا جہاں پاکیزہ ماحول اور اچھی روایات اور شفیق اور دعا گو محنت کرنے والے اساتذہ ملے تو عین ممکن ہے خاکسار اتنے نمبر حاصل نہ کر سکتا اور انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ نہ ملتا۔ ایف ایس سی میں یہ 1960-62ء کا پیریڈ تھا۔ اتنا اچھا ماحول تھا اور خوشگوار فضا تھی کہ یوں لگتا ہے کوئی خواب دیکھا ہو۔ زمین پر چلتے پھرتے فرشتے تھے جو وقف کر کے اس تعلیمی ادارے کو چلا رہے تھے اور اس کے پس منظر میں حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی کی دعائیں اور آپ کے فرزند جلیل حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل ٹی آئی کالج کی حسن تدبیر اور اعلیٰ قسم کی Management اور انتظامی صلاحیتیں کار فرما تھیں۔ چنانچہ اس امر کا اعتراف 1961ء کے جلسہ تقسیم اسناد (Convocation) کے موقع پر اس وقت کے صوبائی سیکرٹری تعلیم پروفیسر سراج الدین صاحب نے صدارتی خطاب ہیں ان الفاظ میں کیا۔

”تعلیم الاسلام کالج دو نمایاں اور ممتاز شخصیتوں والد اور فرزند کی محنت اور محبت و شفقت کا ثمرہ ہے۔ میری مراد آپ کی جماعت کے واجب الاحترم امام جو اس کالج کے بانی ہیں اور ان کے لائق و فائق فرزند مرزا ناصر احمد سے ہے وہ اپنے مشہور و معروف خاندان کی قائم کردہ روایات کو وقف کی روح اور ایک ایسے جذبہ و شوق کے ساتھ چلا رہے ہیں جو دوسرے ممالک میں بھی شاذ ہی نظر آتا ہے۔“

(حیات ناصر صفحہ 231 جلد اول)

اس مضمون میں زیادہ تر ان پروفیسر صاحبان کا ذکر ہو گا جن کی شاگردی کا خاکسار کو شرف حاصل ہوا لیکن پہلے پرنسپل صاحب کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

پرنسپل ٹی آئی کالج ربوہ

حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب

حضرت صاحبزادہ حافظ مرزا ناصر احمد صاحب ایم اے (آکسن) جو خلیفۃ المسیح الثالث کے روحانی اعلیٰ منصب پر 8 نومبر 1965ء کو فائز ہوئے۔ آپ کی عظیم الشان شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی بارعب، شفیق، مقناطیسی شخصیت اور نورانی چہرہ آج بھی خاکسار کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ آپ نے ہماری فرسٹ ایئر کی کلاس کو اپنے ویلکم ایڈرس میں تین نصائح فرمائیں۔ (i) محنت کرنا (ii) دعا کرنا (iii) حسد نہ کرنا (حسد حافظے کو خراب کر دیتا ہے۔)

آپ انتخاب خلافت تک کالج کے پرنسپل رہے۔ کالج کے جنوب مغرب میں آپ کی کوٹھی تھی۔ کالج کے پرنسپل ہونے کے علاوہ آپ پر اس وقت بے شمار اور جماعتی ذمہ داریاں بھی تھیں۔ آپ تعلق باللہ اور توکل اور انقطاع غیر اللہ کے ایسے اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ آپ کے چہرہ کی مسکراہٹ پریشان حال طلباء میں بھی بشاشت اور عزم اور ہمت پیدا کر دیتی تھی۔ کیا بلحاظ تعلیم و تربیت اور کیا بلحاظ گیمز، Debates، علمی شخصیات کے لیکچروں اور تمام ضروری امور ڈسپلن، شاندار روایات، یونیفارم، وقت کی پابندی اور شاندار نتائج۔ ہر لحاظ سے یہ کالج چوٹی کے کالجوں میں سے تھا۔ کسی قسم کی لغویات یہاں نہیں ہوتی تھیں۔ سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ سر پر ٹوپیاں اور طلباء کے کالج کے اوقات میں انڈر گریجوایٹ گاؤن اور اساتذہ کے گریجوایٹ گاؤن زیب تن ہوتے تھے۔ اس شاندار ماحول کا تصور بھی اب محال ہے۔

ٹی آئی کالج کا یہ امتیاز پرنسپل حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کے دم قدم سے تھا۔ آپ سے ملنے کے لئے بڑی بڑی شخصیات کالج میں آتی تھیں۔ خاکسار نے پہلی مرتبہ حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کو بھی کالج میں ہی دیکھا۔ ایک خوبرو پینٹ کوٹ میں ملبوس ٹائی لگائے ہوئے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی آپ کو ملنے پرنسپل آفس میں آئے۔ طلباء آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ یہ پرنسپل محترم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہی انگلستان سے واپس آئے ہیں اور ان دونوں بھائیوں میں آپس میں بہت محبت ہے اور ان کا نام مرزا طاہر احمد ہے اور سب جماعت کے بزرگ آپ کے پاس آتے تھے۔ حضرت مولانا جلال الدین صاحب شمس کو بھی آپ کے پاس آتے ہوئے کئی بار دیکھا گیا۔ حضت مولانا ابو العطاء صاحب جالندھری تو باقاعدہ Theology کا مضمون پڑھانے کالج میں آتے تھے۔ ایک بار سرگودھا کالج کے پرنسپل عبد العلی خان ھی آئے تھے۔ علم کے فروغ کے لئے بڑی بڑی نامور شخصیتوں کو آپ مدعو کرتے رہتے تھے۔ تعلیم کے بارے میں آپ کا جو تصور تھا اس بارے میں 1964ء کے کانووکیشن پر آپ کا مندرجہ ذیل اقتباس اس کی غمازی کرتا ہے۔ فرمایا۔

”۔۔۔علم ایک بحر بے کنار ہے۔اس لئے ایک انسان علم میں خواہ کسی قدر ترقی کر جائے علم ختم نہیں ہوتا۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

۔۔۔کہدے کہ اگر سمندر کو سیاہی بنا کر اس سے خدا تعالیٰ کی معرفت کی باتیں،اس کے دیئے ہوئے علوم اور قدرت کے راز،ضبط تحریر میں لانا چاہو تو وہ ایک سمندر کیا اس جیسا ایک اور سمندر بھی لے آؤ تو وہ بھی ختم ہو جائے گا مگر خدا کی باتیں اور اس کے دیے ہوئے علوم ختم نہ ہوں گے۔(الکہف:110)

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے اور حضور کی اتباع میں ہر مسلمان کی زبان سے یہ کہلوایا کہ

رب زدنی علماً(طٰہٰ:۱۱۵) اے اللہ مجھے اپنی معرفت اور علم میں بڑھاتا جا۔

پس علم کبھی نہ ختم ہونے والی چیز ہے اس لئے آپ تادم حیات علم کی جستجو میں رہیں اور اس کے حصول کے لئے ہمیشہ کوشاں رہیں۔۔۔“۔(حیات ناصر صفحہ218)۔

۱۹۶۵ء کے کانووکیشن پر فرمایا:

”حقیقی علم کا ابدی سر چشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔۔۔۔۔اگر آپ علم سے محبت رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کا تعلق علم کے حقیقی سر چشمہ سے ہمیشہ مضبوط رہے پس اپنی عقل اور علم پر تکیہ نہ کرو بلکہ ہمیشہ علام حقیقی کے آستانہ پر عاجزی اور انکساری کے ساتھ جھکے رہو تا اس تعلق کے طفیل تمہارے دلوں سے بھی ہمیشہ مصفیٰ،میٹھے اور لذیذ علم کے چشمے پھوٹتے رہیں۔۔۔۔۔۔یہ بھی نہ بھولنا کہ انسان علم اس لیے حاصل کرتا ہے کہ خود اس سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کی خدمت کرے۔(حیات ناصر جلد اول صفحہ 21)

تعلیم الاسلام کالج کی پاکیزہ روایات

تعلیم الاسلام کالج کی روایات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے خلیفہ بننے کے بعد کالج تشریف لا کر جلسہ تقسیم اسناد 1966ء کے موقع پر فرمایا:

”اس درس گاہ کے اساتذہ کی یہ روایت ہے کہ وہ اپنے طلباء کے ساتھ بچوں سے بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ان کی جائز ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔دکھ سکھ میں ان کے شریک ہوتے ہیں۔ہر وقت بے نفس خدمت میں لگے رہتے ہیں اور پوری توجہ اور پوری کوشش کے ساتھ بچوں کی رہبری اور رہنمائی میں مصروف رہتے ہیں۔

ہمارے عزیز بچوں میں یہ روایت پختگی کے ساتھ قائم ہو چکی ہے کہ وہ غلط سیاست میں حصہ نہیں لیتے اور سٹرائیک و دیگر ایسی ہی بدعادات سے وہ اتنے ہی دور ہیں جتنی کہ زمین آسمان سے۔

اس درس گاہ کا فکر و عمل مذہب و ملت کی تفریق و امتیاز سے بالا ہے۔ ہر طالب علم خواہ وہ کسی مذہب کسی فرقہ یا سیاسی جماعت سے ہی تعلق کیوں نہ رکھتا ہوں ہر قسم کی جائز سہولتیں حاصل کرتا ہے اور اس کالج کے اساتذہ ہر طالب علم کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کی طرف پوری طرح متوجہ رہتے ہیں۔

یہاں امیر و غریب میں کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا۔ایک غریب کی عزت و احترام کا ویساہی خیال رکھا جاتا ہے جیسا کہ کسی امیر طالب علم کا۔اساتذہ اس طالب علم کی قدر کرتے ہیں جو علمی شوق رکھتا ہو اور علم کی وسیع شاہراہ پر بشاشت اور محنت کے ساتھ آگے بڑھنے والا ہو۔

اور سب سے بڑھ کر ہمارے اساتذہ میں یہ احساس پختگی کے ساتھ قائم ہے کہ محض ظاہری دیکھ بھال اور تربیت کافی نہیں۔ہمارے

بچوں کا پہلا اور آخری حق ہم پر یہ ہے کہ ہم دعاؤں کے ساتھ ان کی مدد کرتے رہیں۔(حیات ناصر جلد اول صفحہ 210 صفحہ 211)

خاکسار کے پاس وہ الفاظ نہیں اور نہ قلم میں وہ طاقت ہے کہ اس عظیم انسان پرنسپل ٹی آئی کالج اور اس عظیم ادارہ ٹی آئی کالج کی خوبیاں اور عظمتیں بیان کرے۔ اس لئے انہی فقرات پر اکتفا کر کے آگے باقی اساتذہ کا ذکر کرتا ہے۔ وما توفیقی الّا باللہ

پروفیسر میاں عطاء الرحمن صاحب (ایم ایس سی بی ٹی)

آپ اس زمانے میں فزکس کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہوتے تھے۔ نہایت درویش منش، لائق، محنتی، زمین پر چلتے پھرتے فرشتے تھے۔ پرنسپل صاحب کی غیر موجودگی میں آپ قائم مقام پرنسپل ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ جب خاکسار کا داخلہ ہوا تو آپ نے ہی انٹرویو لیا اور داخلہ فارم پر دستخط کیے تھے جس کے نیچے Acting Principal کی مہر تھی۔
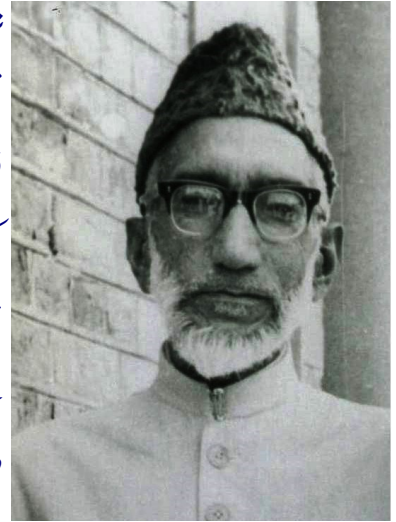
آپ سے ہماری کلاس نے باقاعدہ نہیں پڑھا کیونکہ اور پروفیسر مقرر رہتے (اس وقت آپ بی ایس سی کی کلاسوں کو فزکس پڑھاتے تھے) تاہم چند لیکچر آپ نے بھی ہماری کلاس کو دیے اور اتنے تحمل اور پیار سے پڑھتے تھے کہ ان کے لیکچر کا ایک ایک لفظ لکھا بھی جا سکتا تھا اور مضمون پوری طرح سمجھ آجاتا تھا۔ کمزور سے کمزور ذہن کو مدنظر رکھ کر لیکچر دیا کرتے تھے تاکہ ہر ایک استعداد کے طالب علم کو سمجھ آجائے۔ ایف ایس سی کا رزلٹ نکلنے کے بعد جو عبوری سرٹیفکیٹ کالج کی طرف سے خاکسار کو ملا اس پر بھی قائم مقام پرنسپل کے طور پر آپ کے ہی دستخط تھے۔ آپ کی علمی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے فزکس کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر عبدالبصیر پال اپنے فزکس کے مسائل آپ کے پاس آکر Discuss کرتے تھے۔

آپ کا مالوف وطن حضرت خلیفۃ المسیح الاول کا مولد و مسکن بھیرہ تھا۔ گزشتہ دنوں رجسٹر روایات میں سے مندرجہ ذیل روایت خاکسار کو ملی جو آپ کے بارے میں ہے ایمان افروز ہے۔ محترمہ فاطمہ بی بی صاحبہ بنت (میاں) کرم الدین صاحب (رفیق) 313 میں شامل سکنہ بھیرہ اہلیہ (میاں) اللہ بخش صاحب بحوالہ رجسٹر روایات مبر 13 صفحہ 7 تحریر فرماتی ہیں۔

"میری والدہ صاحبہ مسماۃ طالع بی بی صاحبہ مرحومہ اور والد صاحب نے حضور کو دعویٰ کرتے ہی مان لیا۔ ایک دفعہ میری والدہ کو خواب آئی کہ کوئی بہت بڑے بزرگ آدمی ہیں وہ کہتے ہیں کہ قادیان میں جو امام مہدی صاحب ہیں ان کے ساتھ آپ نکاح پڑھائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لڑکا عطا کرے گا (کیونکہ ان کا لڑکا کوئی نہیں تھا اور خواہش تھی کہ لڑکا ملے) پھر خواب اپنے خاوند کو سنائی انہوں نے قادیان لکھی حضور نے جواباً تحریر فرمایا کہ جس عورت کو یہ خواب آئی اس عورت کو مجھ پر کامل یقین نہیں ہے اگر وہ مجھ پر کامل یقین کرے تو خدا لڑکا عطا کرے گا تو پھر قادیان دستی بیعت کے لئے گئے اور پھر خدا تعالیٰ نے لڑکا عطا فرمایا۔ جس کا نام حضور نے عطاء الرحمن رکھا جو کہ خدا کے فضل سے موجود ہے۔ میری عمر اس وقت 12 سال تھی۔"

(تاریخ احمدیت بھیرہ کے مطابق آپ کی پیدائش 1905ء کی ہے)

پروفیسر نصیر احمد خان صاحب

آپ ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے۔ فزکس کے پروفیسروں کا ذکر چل رہا ہے اس لئے آپ کا یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آپ بڑے ہنس مکھ اور کامیاب پروفیسروں میں سے تھے۔ کئی غیر نصابی سرگرمیاں بھی آپ کے ذمہ تھیں۔ پروفیسر نصیر خان صاحب نے ہماری کلاس کو فرسٹ ایئر میں فزکس پڑھائی۔ خاکسار بالکل غیر معروف اور بیک بنچر طلباء میں سے تھا۔ شروع میں تو انگیزی

میں لیکچرز کی سمجھ ہی نہیں آتی تھی۔ تاہم محنت اور دعاؤں میں لگا رہا۔ ستمبر میں کلاسیں شروع ہوئیں اور دو تین ماہ بعد ہی دسمبر ٹیسٹ شروع ہوئے جن میں مشکل سے پاس ہوا۔ جلسہ سالانہ آیا۔ اس پر ڈیوٹی دی۔ دعائیں کیں۔ بہت فکر مند رہتا تھا کہ کیا بنے گا؟ یکم اپریل کو سالانہ امتحان کے لئے فری ہو گئے۔ چودہ یا پندرہ تاریخ کو امتحان شروع ہوا اور امتحان ختم ہوتے ہی سیکنڈ ایئر کی کلاسیں شروع ہو گئیں اور رزلٹ ساتھ ساتھ تیار ہو رہا تھا۔ فزکس کی کلاس میں نصیر خان صاحب تشریف لائے اور پہلے ایک لڑکے کا رول نمبر پکار کر کھڑا کیا اور اس پر اظہار افسوس کیا کہ اس کے فزکس میں سب سے کم نمبر آئے ہیں۔ خاکسار قدرے تاخیر سے داخل ہوا تھا اور رول نمبر 188 تھا۔ پھر آپ نے کہا کہ رول نمبر 188 کون ہے؟ وہ کھڑا ہو جائے۔ خاکسار ڈرا ڈرا کھڑا ہوا اور دل میں خیال گزرا کہ فزکس کا پیپر تو اچھا ہو گیا تھا نہ جانے خاکسار کو کیوں کھڑا کیا ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ آپ تو چھپے رستم نکلے ہیں۔ کلاس میں اول پوزیشن لی ہے۔ اس کے بعد خاکسار کے کلاس فیلو خاکسار کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھتے اتنا پڑھتے ہو؟ کیسے پڑھتے ہو؟ اس قسم کے کئی سوال ہوتے تھے اور خاکسار اندر ہی اندر اپنی نالائقی پر ہنستا تھا کہ انہوں نے کب سے خاکسار کو لائق سمجھنا شروع کر دیا ہے۔

چنانچہ 1980ء سے جلسہ سالانہ ربوہ کے موقع پر شعبہ ترجمانی کے لئے جو سسٹم ڈیزائن ہو کر رائج ہے وہ بھی انہوں نے ہی اپنے ایک ہونہار اور لائق شاگرد (جو نئے احمدی ہوئے تھے اور اخلاص میں بہت بڑھے ہوئے ہیں) محترم انجینئر ملک لال خان صاحب (حال امیر کینیڈا) کے ذریعے شروع کروایا تھا۔ خاکسار جیسے نالائق شاگرد سے بھی انہوں نے ایک مرتبہ اپنی ایم ایس سی کی کلاس کو "پاکستان میں بجلی کی پیداوار اور اس کی ترسیل" پر لیکچر دلوایا تھا۔ انہوں نے وہ خط و کتابت بھی دکھائی جو ڈاکٹر سلام اور حکومت کے درمیان ان کے ایم ایس سی کلاسز کو پڑھانے سے ایک انٹرمیڈیٹ کالج میں تبادلے کے سلسلہ میں ہوئی تھی۔ حضرت خلیفہ ثالث کی شدید خواہش تھی کہ تعلیم الاسلام کالج کے کئی اہم شعبوں میں ایم اے، ایم ایس سی کی کلاسیں شروع ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پروفیسر نصیر احمد خان صاحب کو پی ایچ ڈی کے لئے بھجوایا اور پروفیسر صاحب کامیاب و کامران ڈاکٹر نصیر احمد خان بن کر واپس آئے اور اتنی محنت اور لگن سے ایم ایس سی کلاسیں شروع کیں کہ

ایک سال ٹی آئی کالج کا طالب علم پوری یونیورسٹی میں اوّل آ گیا لیکن کالج کے قومیائے جانے کے بعد صورت حال ابتر ہوتی چلی گئی۔ اللہ تعالیٰ رحم کرے۔

پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان صاحب خلافت رابعہ کے شروع میں قدرے جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حضور نے جلسہ سالانہ 1983ء کے موقع پر آپ کا بڑی محبت سے ذکر فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

پروفیسر مسعود احمد عاطف صاحب

فزکس کے پروفیسروں میں مکرم مسعود احمد عاطف صاحب بھی تھے جو کہ حضرت مولانا عبد الرحیم درد صاحب کے داماد تھے۔ آپ سے پڑھنے کا موقع تو نہیں ملا تاہم ایف ایس سی کے پریکٹیکلز کے دوران Internal Examiner تھے اور بڑے ہمدرد انسان تھے۔ اس سے چند سال قبل غالباً 1958ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ میں سائنس کے پریکٹیکل کے ممتحن بن کر آئے تھے اور ہمارے والد صاحب (میاں فضل الرحمن بسمل صاحب بی اے بی ٹی) نے انہیں اپنے گھر بھی کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس لئے کالج میں تعلیم کے دوران ان سے بھی جان پہچان رہی۔ یہ بھی بہت جلد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

پروفیسر محمد اسلم قریشی صاحب

یہ بھی فزکس کے پروفیسر تھے غالباً احمدی نہیں تھے لیکن بالکل غیر متعصب انسان تھے۔ کلاس کو بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ سیکنڈ ایئر میں ہمیں آپ نے پڑھایا تھا۔

کیمسٹری کے اساتذہ

پروفیسر ڈاکٹر سلطان محمود شاہد صاحب

فرسٹ ایئر میں کیمسٹری ہمیں ڈاکٹر پروفیسر سلطان محمود شاہد صاحب

(ڈاکٹر ایس ایم شاہد) نے پڑھائی۔ بڑے ہردلعزیز اور سادہ قسم کے انسان ہیں۔ (اب ضعیف ہو گئے ہیں) بہت ہنس مکھ۔ پڑھانے کا انداز بہت عمدہ۔ قادیان کے زمانے کے کئی بار لطیفے بھی سناتے تھے اور اس طرح انگلستان Ph.D کے زمانے کے سبق آموز واقعات بھی۔ سیکنڈ ایئر کی کلاسیں شروع ہوئیں تو اگلا رزلٹ ان کے مضمون کا تھا۔ انہوں نے بھی بتایا کہ خاکسار کیمسٹری میں بھی اپنی کلاس میں اول آیا۔ آپ کی ایک اور پروفیس کے ساتھ مل کر لکھی ہوئی کیمسٹری کی کتاب ہماری ٹیکسٹ بک ہوا کرتی تھی۔

پروفیسر مبارک احمد انصاری صاحب

سیکنڈ ایئر میں کیمسٹری پڑھانے کے لئے پروفیسر مبارک احمد انصاری

صاحب مقرر ہوئے۔ بہت شریف النفس انسان اور شفیق اساتذہ میں سے تھے۔ اب کینیڈا نقل مکانی کر گئے ہیں۔

پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب

کیمسٹری کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب ہوا کرتے تھے جو کہ حضرت ذوالفقار علی خان گوہر کے بڑے بیٹے اور مولانا عبد المالک خان صاحب ناظر اصلاح وارشاد مرکزیہ کے بڑے بھائی تھے۔ ان سے ہمیں پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ اس وقت بی ایس سی کی کلاسوں کو پڑھاتے تھے۔
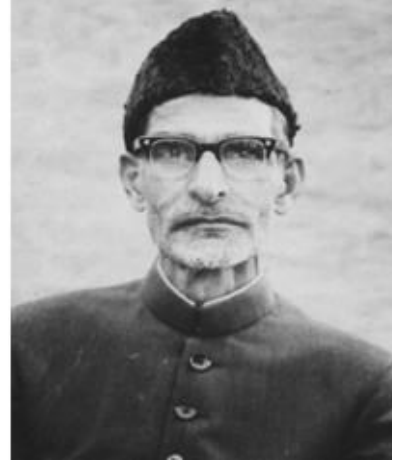
پروفیسر سعید اللہ خان صاحب

کیمسٹری لیبارٹری میں پروفیسر سعید اللہ خان صاحب پریکٹیکل کروایا کرتے تھے۔

محترم پروفیسر سعید اللہ خان صاحب اصل میں ایم اے (شماریات) ہیں۔ انہوں نے بی ایس سی میں کیمسٹری میں پنجاب یونیورسٹی میں پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس لئے جب تک باقاعدہ شماریات (Statistics) کا شعبہ کالج میں نہیں کھلا وہ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے۔

ریاضی کے اساتذہ

پروفیسر محمد ابراہیم ناصر صاحب

ایف ایس سی میں ہماری کلاس کو میتھ پڑھانے کے لئے محترم پروفیسر محمد ابراہیم ناصر صاحب مقرر ہوئے۔ آپ واقف زندگی تھے اور پہلے ایران میں مشنری بھی رہ چکے تھے۔ نہایت شفیق پروفیسر تھے اور محنت سے کلاس کو پڑھاتے تھے۔ جب فرسٹ ایئر کا امتحان ہوا تو پری میڈیکل کلاس میں خاکسار کی دوسری پوزیشن تھی۔ خاکسار کے بڑے

بھائی محمد عبداللطیف شاہد اسی کالج میں خاکسار سے چند سال آگے تھے۔ ان کی وساطت سے آپ سے تعارف ہوا۔ موصوف کا تعلق بھی اس علاقے سے تھا۔ یعنی ان کے آباؤ اجداد کا گھوگھیاٹ (میانی) جو حضرت خلیفہ اوّل کے مسکن و مولد بھیرہ کے قرب وجوار میں ہے۔ اس لحاظ سے بھی ہم پر شفقت فرماتے تھے۔ جہاں تک خاکسار کو یاد ہے وہ کنٹرولر آف ایگزیمنیشن بھی تھے۔ ان کی رہائش دارالصدر شمالی حلقہ انوار میں تھی جہاں اب ان کے ایک صاحبزادے داؤد احمد صاحب رہائش پذیر ہیں۔

پروفیسر چوہدری حمید اللہ صاحب

آپ بھی ان دنوں میتھ (Math) پڑھانے پر مامور تھے لیکن ہماری کلاس ان سے نہیں پڑھی۔ اس وقت آپ بی اے بی ایس سی کی کلاسز کو پڑھاتے تھے۔ آپ واقف زندگی ہیں۔ نہایت زیرک، محنتی اور مخلص واقفِ زندگی تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو صدر مجلس خدام

الاحمدیہ مرکزیہ، افسر جلسہ سالانہ، صدر مجلس انصار اللہ اور وکیل

اعلیٰ تحریک جدید جیسے اعلیٰ منصبوں پر فائز کیا، جہاں انہوں نے اپنی محنت وذہانت اور اخلاص کی وجہ سے ہمیشہ ہی خلیفۂ وقت کی خوشنودی حاصل کی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو 2003ء میں یہ بھی منفرد اعزاز بخشا کہ آپ نے مجلس انتخابِ خلافت کے اجلاس کی صدارت فرمائی جس میں اللہ تعالیٰ کی غالب تقدیر کے ماتحت حضرت صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس منتخب ہوے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت اور عمر میں بیحد برکت دے۔ آمین

آپ ان پروفیسرز میں سے تھے جنہیں کالج کے قومیائے جانے کے بعد جلد ہی حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے جماعتی اداروں میں واپس بلوالیا تھا۔

پروفیسر عبدالرشید غنی صاحب

آپ بھی ہمارے زمانے میں ٹی آئی کالج میں میتھ پڑھاتے تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ایڈیشنل وکیل المال اوّل کے طور پر بھی خدمت کی توفیق پائی۔ آپ مجلس انصار اللہ میں مسلسل کئی سال قائد مال کے طور پر بھی خدمت کی توفیق پاتے رہے ہیں۔ چند سال قبل وفات پاچکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے۔ آمین۔
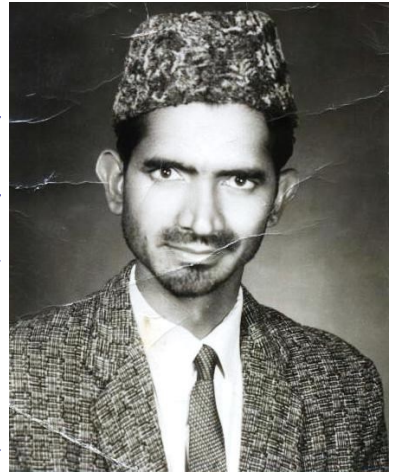
انگلش ڈیپارٹمنٹ

صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب

ہمارے دور میں انگلش کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب ہوا کرتے تھے۔

آپ حضرت مسیح موعود کے خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ حضرت مرزا عزیز احمد صاحب کے بڑے بیٹے اور حضرت مرزا سلطان احمد صاحب کے پوتے ہیں۔ حضرت مرزا سلطان احمد صاحب حضرت مسیح موعود بانی سلسلہ احمدیہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

کالج کے قومیائے جانے کے غالباً فوراً بعد آپ کو کالج سے بلوالیا گیا اور جماعتی اداروں میں خدمات پر مامور کر دیا گیا۔ آپ نے ناظر امور عامہ، ناظر امور خارجہ کے طور بھی کام کیا اور اب خلافت خامسہ کے آغاز سے ناظر اعلیٰ اور امیر مقامی کے طور پر دن رات خلیفۂ وقت کا دست وبازو بن کر خدمت کی توفیق پارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت اور عمر میں برکت دے۔ آمین

پروفیسر محمد شریف خالد صاحب

ایف ایس سی میں ہماری کلاس کو انگلش A کا مضمون محترم پروفیسر محمد شریف

خالد صاحب نے پڑھایا۔ آپ کی Vocabulary بڑی زبردست تھی۔ آپ کو شعر وشاعری سے بھی شغف تھا۔ بعض اوقات غالب کا شعر بورڈ پر لکھ کر کہتے کہ اسے انگریزی زبان میں Explain کریں ۔ایسا ایک شعر خاکسار کو اب تک یاد ہے۔

واں گیا میں بھی تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے اسے کیا Explain کرنا تھا۔ یہ شعر تو ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ بعض پنجابی شاعروں کے بھی آپ بڑے مداح تھے اور کہتے تھے کہ ان کا کلام اتنا گہرا ہے کہ اگر یورپ جیسے برِّ اعظم میں ہوتے تو شیکسپئر کی طرح مشہور ہوتے۔ بعد میں خاکسار کی ان کے ساتھ ربوہ میں ملاقات ہوتی رہی اور مل کر ہمیشہ خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ اب وہ وفات پا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے۔ آمین

پروفیسر حمید احمد صاحب

آپ اس وقت نسبتاً Young تھے۔ انگلش B کا مضمون ہمیں پڑھاتے تھے ۔ دارالرحمت شرقی میں ان کی رہائش تھی۔ بعد میں وہ نائیجیریا گورنمنٹ ملازمت میں چلے گئے اور اب جرمنی میں Settled ہیں۔ خاکسار کو 2000ء میں جلسہ سالانہ برطانیہ سے جرمنی جانے کا اتفاق ہوا اور ایک جمعہ بیت نور فرینکفرٹ میں پڑھا۔ وہاں کئی سالوں بعد ان سے ملاقات ہوئی اور جتنے دن وہاں رہا کئی بار فون پر بات ہوتی رہی۔ اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عمر میں برکت دے۔ آمین

متفرق اساتذہ کا ذکر

حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری

ٹی آئی کالج ربوہ میں ایک Theology کا مضمون ہوتا تھا جس میں قرآن کریم کا کچھ حصہ ہوتا تھا، یہ مضمون پڑھانے کے لئے جامعہ احمدیہ سے حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری (خالد احمدیت) تشریف لاتے تھے۔ آپ سابق مشنری بلاد عربیہ تھے اور جماعت کے بہت بڑے عالم فاضل تھے۔ حضرت مصلح موعود نے حضرت مولانا جلال الدین صاحب شمس کو اور آپ کو اور حضرت ملک عبدالرحمن خادم صاحب کو 1956ء کے جلسہ سالانہ پر خالد احمدیت کا خطاب دیا تھا۔

مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری کے ایک صاحبزادے مولانا عطاء المجیب راشد صاحب (مشنری انچارج برطانیہ) ہم سے کالج میں ایک دو سال آگے تھے اور بڑے اچھے مقرر ہوا کرتے تھے۔

ملک محمد عبداللہ صاحب

Theology کے ایک اور پروفیسر ملک محمد عبداللہ صاحب تھے جن کے ایک صاحبزادے Ph..D ڈاکٹر مقبول احمد صاحب اسلام آباد ہمارے کلاس فیلو تھے۔ حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب اور ملک

محمد عبداللہ صاحب وفات پا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرماتا رہے۔ آمین

پروفیسر سلطان اکبر صاحب

شعبہ عربی سے متعلق تھے اور انہوں نے ہماری کلاس کو عربی Optional کا مضمون پڑھایا تھا۔ اب بھی بڑی شفقت فرماتے ہیں۔ آپ نے خاکسار کو حضرت خلیفہ اوّل کے اس عربی مکتوب اور قصیدہ کا ترجمہ کرکے دیا جو روحانی خزائن 7 میں شامل اور صفحہ 149 سے
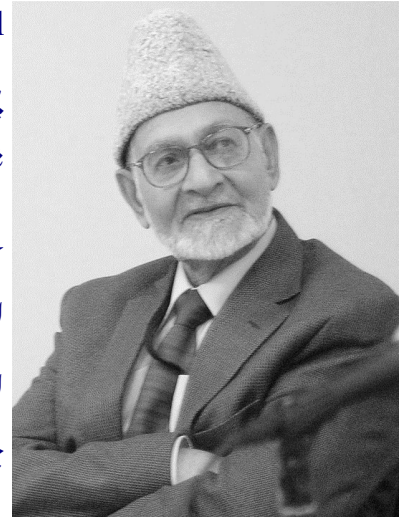
شروع ہو کر صفحہ 153 پر ختم ہوتا ہے۔
خاکسار کی ایک بچی بھی ان سے ایم اے (عربی) میں پڑھتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عمر میں برکت دے۔ آمین

پروفیسر صوفی بشارت الرحمن صاحب

آپ شعبہ عربی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے اور کالج کی Admn. کے انچارج تھے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کے قریبی احباب میں سے تھے اور کالج میں ان کا بڑا رعب اور دبدبہ ہوا کرتا تھا۔
آپ سے بعد میں بھی تعلق رہا۔ صدر مجلس کارپرداز اور ناظر تعلیم بھی رہے۔ وفات کے وقت وکیل التعلیم تحریک جدید کے طور پر خدمت بجا لا رہے تھے۔ خاکسار کو ایک مرتبہ بتایا کہ خدا نے مجھے اگلے خلیفہ کے بارے میں بتایا ہوا ہے لیکن آپ کو نہیں بتاؤں گا پھر باتوں باتوں میں حضرت مرزا مسرور احمد صاحب کا نام بھی لے گئے جس کی سمجھ کئی سال بعد 22 اپریل 2003ء کے انتخاب کے دوران آئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

پروفیسر شیخ محبوب عالم خالد صاحب

آپ شعبہ اردو کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے آپ کو حضرت پرنسپل صاحب کا کلاس فیلو ہونے کا شرف حاصل تھا، اس لیے حضور کے بہت قریب تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک لمبا عرصہ پرائیویٹ سیکرٹری حضرت خلیفۃ المسیح الثالث، ناظر مال آمد اور کئی اہم جماعتی عہدوں پر رہے۔ نہایت منکسر المزاج دعا گو بزرگ تھے۔
حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے چوہدری ظہور احمد باجوہ صاحب کی وفات پر آپ کو صدر، صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ کے منصب پر فائز فرمایا تھا اور اس خدمت کے دوران خلافت خامسہ کے ابتدائی سالوں میں آپ کی وفات ہوئی۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائے۔ آمین
آپ کے ایک صاحبزادے پروفیسر منور شمیم خالد صاحب بھی کالج میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر رہے ہیں۔
اردو کے شعبہ میں ہمارے ایف ایس سی کر جانے کے بعد ایک نامور

شخصیت ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب بھی آئے جو اپنے ادبی کاموں اور شاعرانہ مزاج کی وجہ سے جماعت میں کافی مشہور ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

چوہدری محفوظ الرحمن صاحب ایم اے

آپ فزیکل ایجوکیشن سے متعلق تھے واقف زندگی تھے اکثر گیمیں

یہی کرواتے تھے۔ کالج میں لائبریری کے انچارج بھی رہے۔ اب تک ماشاء اللہ بہت فعال ہیں۔ بیت انوار دارالصدر شمالی ربوہ کی زینت تھے۔

پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب

آپ فلسفہ کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے۔ ایک آدھ بار انگلش کے پروفیسر کے چھٹی پر ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہماری کلاس کو انگریزی بھی پڑھائی تھی۔ آپ بھی پرنسپل صاحب کے خاص احباب میں سے تھے۔
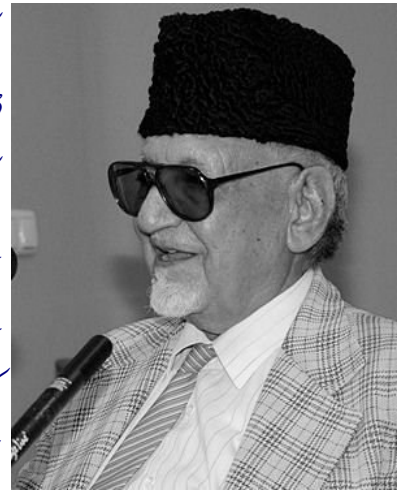
آپ اور پروفیسر نصیر خان صاحب عموماً باسکٹ بال ٹورنامنٹ کے انچارج ہوا کرتے تھے۔ بعد میں ٹی آئی کالج ربوہ کا پرنسپل ہونے کا آپ کو بھی اعزاز حاصل ہوا۔

آج کل آپ وکیل التصنیف تحریک جدید کے طور پر حضرت مسیح موعود کی کتب کے تراجم پر کام کر رہے ہیں۔ آپ نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع پر کتاب A man of God کا اردو ترجمہ "اک مرد خدا" بھی کیا ہے۔

بہر حال علمی لحاظ سے بہت قیمتی اور قابل قدر وجود ہیں۔ جب خاکسار کو حضرت خلیفہ ثالث کی سیرت و سوانح کا کام تفویض ہوا تو آپ اور صاحبزادہ مرزا انس احمد صاحب اس کام کے لئے نگران کمیٹی کے طور پر مقرر تھے۔

باقی اساتذہ کا ذکر ممکن نہیں صرف ان کا ذکر کیا ہے جن سے خاکسار کو پڑھنے کا اتفاق ہوا یا کسی طرح سے واسطہ پڑا۔ ورنہ سب اساتذہ کا اتنا احسان ہے کہ ان پر ایک کتاب مرتب ہونی چاہئے تاکہ ان کے لئے دعاؤں کا سلسلہ جاری رہے۔

(بشکریہ الفضل ربوہ۔ نومبر ۱۷ اور ۱۹۔ ۲۰۱۴ء)

افسانہ
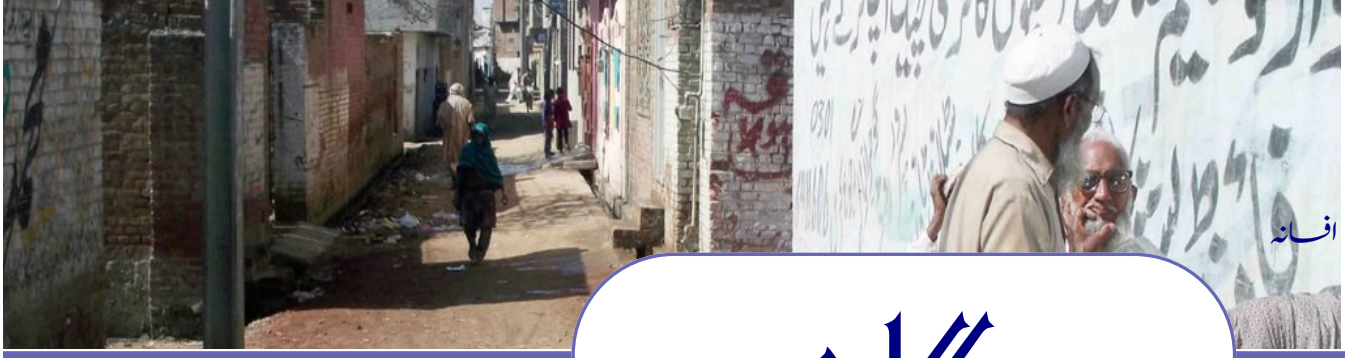
گلی

شاہین کاظمی (سویٹزرلینڈ)

ہر طرف بے نام سی خاموشی کا راج تھا، گھنے درختوں کی اوٹ میں دم سادھ کر بیٹھی ہوا، سورج کی تھکی تھکی کرنیں۔ تھڑوں کے نیچے دبکے کتے ٹانگوں پر تھوتھنی جمائے نڈھال نظر آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ کریانے کی دوکان پر سارا دن چہلیں کرنے والے لڑکے بالے بھی غائب تھے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی، اُستانی نسرین کی بڑی بیٹی رفعت کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ میرے چاروں طرف جیسے دھول اُڑنے لگی۔

"ہائے کیسا ظلم کیا اس لڑکی نے۔ اپنی بیوہ ماں کی عمر بھر کی محنت سے کمائی عزت پل بھر میں مٹی میں ملا دی۔"

میں کھٹک تو اُسی دن گئی تھی جس دن نذیر ٹھیکیدار کے بیٹے کو دیکھ کر رفعت کے قدم ٹھٹھکے تھے۔ اُس دن سکول سے واپسی پر رفعت کے ساتھ اُس کی چھوٹی بہن مُنی، ٹھیکیدار کے گھر کے آگے بنے تھڑے پر دھرنا دے کر بیٹھ گئی۔

"آپا تھک گئی میں تو۔" مُنی نے آپا کو بہت کچھ کہتی نظروں سے دیکھا۔ اتنے میں ٹھیکیدار کا بیٹا باہر نکل آیا۔ اور بہت پیار سے مُنی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بستہ اُسے تھما دیا۔

"اچھے بچے ضد نہیں کرتے جاؤ گھر جاؤ۔" اور مُنی خاموشی سے اٹھ کر چل دی۔ اور کسی نے دیکھا ہو یا نہیں مگر ٹھیکیدار کے بیٹے کی مٹھی میں دبا کاغذ مُنی کے بستے میں سرکتے سے میری نظروں سے بچ نہ سکا۔ اور پھر یہ روز روز ہونے لگا۔ کبھی مُنی تھک جاتی۔ کبھی اُسے پیاس ستانے لگتی۔ اور کبھی تھڑے کے نیچے دبکے کُتوں سے اُسے ڈر لگنے لگتا۔ اور آج یہ خبر۔

"آئے ہائے آپا جانے کس منحوس نے بے پر کی اُڑا دی۔ رفعت اپنی خالہ کے گھر گئی ہے کل تک آ جائے گی۔"

اُستانی جی بہت غصے میں تھیں۔ آغا جی کی بہو کے منہ سے ہمدردی کے چند بول سن کر اُلٹا اُسی پر برس پڑیں۔ ہمیشہ کی حلیم طبع اُستانی کو اتنے غصے میں دیکھ کر آغا جی کی بہو حق دق رہ گئی۔

"نا اس میں اتنا سیخ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"لے آپا آپ بھی کمال کرتی ہیں اب کیا نظر اُتاروں آپ کی؟" اُستانی جی چمک کر بولیں۔

"آپ کو کیا حق پہنچتا ہے میری بیٹی کے بارے میں ایسی واہیات بات کرنے کا۔"

بات اُستانی جی کی بھی سچ تھی سو بہو بیگم ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کو سدھاریں۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ رفعت بی تین دن بعد گھر موجود تھیں۔ سُتے ہوئے چہرے اور سُوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔ لیکن اس سے بھی حیران کُن بات یہ ہوئی کہ مُنی نے سکول کا رستہ بدل دیا اور ٹھیکیدار کا اکلوتا بیٹا بھی درہم کمانے کی غرض سے دوبئی جا بیٹھا۔

"ہائے! میرے وجود میں دراڑیں سی پڑنے لگیں۔" کرموا چھی کس بیدردی سے اپنی بیوی کو پیٹ رہا تھا۔

" ارے کوئی ہے بچاؤ اِسے بچاری پیٹ سے ہے۔" میں مدد کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، لیکن بند دروازوں کے پیچھے موت کا سا سکوت تھا، سو وہ پٹتی رہی۔

" اُوئے خنزیر کی اولاد کیا مار ڈالے گا اِسے؟" آغاجی جانے کہاں سے برآمد ہوئے اور اِس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آغاجی آپ درمیان میں نہ آئیں۔" کرموا چھی کے منہ سے کف اُڑ رہا تھا۔

" نکرمے عورت ذات ہے کچھ حیا کر اِس کی حالت دیکھ۔" حاجی صاحب بھی باہر نکل آئے۔

" تو اندر جا بیٹی۔" حاجی صاحب نے نجو کے سر پر ہاتھ رکھا یہ یہاں کا روز کا معمول تھا، غربت کی دہلیز پر بیٹھی پانچ بیٹیاں کرموا چھی کو ڈس رہی تھیں

" اِس کم جات نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔" کرمو وہیں حاجی صاحب کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

" اب تو یار لوگ بھی ہنستے ہیں مجھ پر۔"

"کچھ خدا کا خوف کر کرمو کیا اول فول بک رہا ہے۔ اِس میں اِس بچاری کا کیا قصور؟" آغاجی نے اِسے گھورا۔

" یہ تو اُس رَبّ سوہنے کی دین ہے۔"

" اتنا ہی مرد ہے تو ڈھال دیتا اُس کی کوکھ میں اپنے جیسا ایک۔" شیدو نائی دانت نکوستا ہوا اُس پر فقرہ اچھال گیا۔

" دیکھا آپ نے حاجی صاحب؟" کرمو غصے سے بل کھا رہا تھا

" قصور تیرا ہے تُو جو یہاں روز مجرا کرنے آجاتا ہے تماش بین تو آئیں گے۔" آغاجی کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔

" جو بھی ہو اب کی بار نہیں بچے گی رانڈ میرے ہاتھ سے۔" کرموا ٹھ کھڑا ہوا اور میں تفکر سے اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

میرا بس چلتا تو میں ایسے تمام مردوں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی مار دیتی۔ یہ مجھے دنیا کی سب سے قابل رحم مخلوق لگا کرتے۔ کسی بھوکے درندے کی طرح دندناتے ہوئے۔ بھوک کوئی بھی ہو تن۔ دھن۔ یا بَل کی۔ اِن کی رال ٹپکاتی زبانیں ہمیشہ لپلپاتی رہتیں۔

اچانک نکڑ پر سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ یہ شریف مستری کا بیٹا تھا۔ لنڈے کی پرانی گھسی ہوئی جینز پر پیلے رنگ کی شرٹ اور گلے میں لال رومال باندھے خود کو کسی راجہ اِندر سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ سامنے زینت کے کرایے داروں کی لڑکی سے اُس کا آنکھ مٹکا چل رہا تھا۔ دن میں پندرہ بار اُس کے گھر کا طواف ہوتا۔ اور وہ بھی شوخ رنگوں کے تنگ کپڑے پہنے سستی ادائیں دکھاتے ہوئے ہر بار کسی نئی شے کی فرمائش کر دیتی۔ انھیں یہاں آئے ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے۔ لیکن محلے کے جوانی کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے چھوکروں کو اچھا خاصا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا، اپنی پتلی پتلی ٹانگوں پر کسّی ہوئی بدرنگ پتلونیں چڑھائے سارا دن محلے کی اکلوتی کریانے کی دوکان کے سامنے کھڑے ایک دوسرے سے فحش مذاق کیا کرتے اور

نظریں مستقل سامنے والے دروازے پر جمی ہوتیں۔ شریف زادیوں کا وہاں سے گذرنا محال ہو گیا۔ اُس دن تو شمیم باجی کی نند نے بے لحاظ ہو کر بے بھاؤ کی سنا بھی دیں۔ چار دن امن رہا اب پھر وہی حال تھا۔

میرے دائیں بائیں اطراف میں بنے ہوئے مکانات کے باہر کو نکلتے ہوئے تھڑے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ ان کے نیچے بہنے والی گندی نالیوں کی بدبو۔ اور کناروں پر لوٹتے کتے جو ہر آنے جانے والے پر بھونکنا اپنا فرضِ منصبی خیال کرتے۔ روز لاتیں یا اینٹ کھا کر اپنے ہی زخم چاٹتے پھرتے۔ لیکن مجال ہے جو ان کے معمول میں رتی فرق آیا ہو گرمیوں کی سلگتی دوپہریں ہوں یا سرما کی ٹھٹھرا دینے والی راتیں ان کی چاؤں چاؤں جاری رہتی۔

خیر چھوڑیں، میں بات کر رہی تھی نجو کی۔ کرمو ماچھی اتنا بُرا نہ تھا۔ نجو سے پیار بھی کرتا تھا۔ لیکن یہ گذرے زمانوں کی بات تھی جب نجو بیاہ کر آئی تھی۔ سانولی رنگت اور خوبصورت چہرے والی نجو کرمو کے دل کا چین تھی۔ یہ چین تیسری بیٹی ہونے تک برقرار رہا۔ جب کرمو کی ماں نے اُٹھتے بیٹھتے نجو کو کوسنا شروع کیا تو چین دھیرے دھیرے بے چینی میں ڈھلنے لگا۔ اِس پر اُس کے چھوٹے بھائی کا رویہ۔ دو بیٹوں کا باپ کیا بنا۔ پاؤں زمین چھونے سے انکاری ہو گئے۔ کرمو کو ایسے دیکھتا جیسے اچھوت ہو۔ اِس بے توقیری کا سارا غصہ نجو پر اترتا۔ اور نجو بے قصور ہوتے ہوئے بھی روز پٹتی۔ رات ڈھلے جب کرمو نجو کے زخموں پر ہلدی ملا تیل لگاتا تو اُس کی آنکھوں سے بُوند بُوند ٹپکتا پانی کرمو کو اپنے دل پر گرتا محسوس ہوتا۔

"معاف کر دے نجو، مجھے جانے کیا ہو جاتا ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ دیتا۔ اور نجو تن کا درد من میں اُتار کر ہر بار اُسے معاف کر دیتی۔ آخر وہ اِس کی بیٹیوں کا باپ تھا۔

"عجیب کتا رشتہ ہوتا ہے یہ بھی۔" ساتھ والی خورشید ہنسے جاتی

"تو سچ کہتی ہے خورشید بندہ تھک جاتا ہے اِس رشتے کو نبھاتے نبھاتے۔"

"روز روز کی چک چک سے بہت تنگ ہوں خورشید۔"

"لیکن کرمو کو چھوڑ کر میں اِس ٹبر کو لے کر جاؤں بھی تو کس کے دروازے پر۔" نجو کی آنکھیں پھر سے ساون بن جاتیں۔

"تُو دل چھوٹا نہ کر ربّ سوہنا ضرور تیری سُنے گا۔"

اور نجو پھولے ہوئے پیٹ اور ذہن میں پلتے وسوسوں میں الجھ جاتی۔

"اگر اب بھی بیٹی ہوئی تو؟" نجو کی آواز میں جانے کیا تھا خورشید تڑپ اٹھی۔

"ساری عمر خوف اور وسوسوں کی صلیب پر لٹکے رہنا کیا یہی عورت کی زندگی ہے؟" میں نجو اور خورشید کو دیکھ کر بہت رنجیدہ ہو گئی۔

بارشوں کے دن تھے۔ نشیبی علاقے میں ہونے کے باعث بستی ہمیشہ جنوب میں بہنے والے برساتی نالے کی زد میں آجاتی۔ بستی والوں نے اپنی مدد آپ کے تحت ایک کچا پشتہ تعمیر کر کے سیلابی پانی کا راستہ تو بدل دیا تھا لیکن پشتے کی باقاعدہ دیکھ بھال کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اِس کام کی ذمہ داری کرمو ماچھی نے سنبھال لی۔ محلے کا ہر گھر حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ دے دیا کرتا۔ جس میں آغا جی اور ٹھیکیدار صاحب اپنے پاس سے کچھ ملا کر کرمو کے ہاتھ پر دھر دیا کرتے۔

کرمو بہت خوش تھا۔ گھر کے حالات بہتر ہوئے تو اُس کے مزاج کی کڑواہٹ بھی کم ہونے لگی۔ اُس دن شدید بارش تھی۔ کرمو نے پوری رات پشتے پر گذار دی۔ صبح اذانوں کے ساتھ گھر پلٹتے ہوئے کچرا

کنڈی سے آنے والی عجیب سی آوازوں نے اُس کے قدم روک لئے۔ اندر کا منظر دیکھ کر جی دار ہوتے ہوئے بھی کرمو کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"بیٹا مبارک ہو کرم دین۔" نذیر کرمو کو دروازے پر سبز پتے باندھتے دیکھ کر اُس کی طرف چلا آیا۔ کرمو کو اُس کے منہ سے کرم دین سن کر بہت بھلا لگا۔ اُس کا سینہ بے اختیار پھول گیا۔ بیٹے کا باپ ہونا بھی کیسا سرور دیتا ہے۔۔۔

"لیکن یہ رُکھ، کیوں؟"

"بھائیا بڑی منتوں مرادوں کے بعد ربّ سوہنے نے یہ دن دکھایا ہے۔ اِس لئے چالیس دن کی رکھ رہے گی۔ نجو نظر لگ جانے سے ڈرتی ہے۔" کرمو نے وضاحت کی۔

"تو اس کا مطلب چالیس دن بعد بھتیجے کا دیدار نصیب ہو گا۔"

"اچھا اللہ اُسے لمبی عمر دے۔" نذیر دعا دے کر آگے بڑھ گیا کرمو بہت خوش تھا۔ گھر گھر مٹھائی بانٹتا پھر رہا تھا۔ اُستانی جی کی بڑی بیٹی نے مٹھائی وصول کی تو ساتھ ہی ایک تھیلا کرمو کی طرف بڑھا دیا۔

"چاچا یہ کچھ کپڑے ہیں مُنے کے لئے۔"

"بیٹے کا بہت خیال رکھنا چاچا۔" کرمو پلٹنے ہی والا تھا کہ اُس کے کانوں سے ہلکی سی سرگوشی ٹکرائی۔ اُس دن موسلا دھار برستی بارش میں جب رفعت اپنے نوزائیدہ بیٹے کو کچرا کنڈی میں ڈال کر پلٹی تو کرمو کو آتا دیکھ کر جلدی سے درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس کا دل کٹ رہا تھا لیکن کرتی بھی تو کیا، ہمیشہ ساتھ نبھانے کی قسمیں کھانے والا باپ کی ایک للکار پر سہم کر دوبئی جا بیٹھا۔ اور وہ گناہ اور بدنامی کا بوجھ اٹھائے گھر لوٹ آئی۔ ٹھیکیدار نے رفعت کے ساتھ ساتھ اُس کی ماں کو بھی جانے کیا کچھ سنا ڈالا تھا۔ اور صاحبزادہ ہونٹ سیے بس پاؤں سے زمین کریدتا رہا۔ اُس وقت رفعت کا دل چاہا کاش وہ اُس کو اِسی زمین میں گاڑ سکتی۔ کرمو ننھی سی گٹھڑی سینے سے لگائے تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا، رفعت کے آنسوؤں کا نمک بارش کے پانی میں گھلتا رہا۔ جلتے ہوئے دل کے کسی ایک گوشے میں ٹھنڈک اُتر آئی تھی۔ شاید وہ بچ جائے۔ اُس نے بھیگے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ملتجی نظروں سے روتے بلکتے سیاہ آسمان کو دیکھا اور خاموشی سے گھر کی طرف ہو لی۔ بھیگے کپڑے الگنی پر ڈال کر وہ اندر آئی تو استانی جی نے اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

"ماں حاجی صاحب جو شریف مستری کے بیٹے کا رشتہ لائے تھے انھیں ہاں کہہ دینا۔"

صبح ہونے کو تھی اُس نے بتی بند کی اور بستر پر لیٹ گئی۔

دروازے کی جھریوں سے ہلکا ہلکا اجالا اندر جھانکنے لگا تھا۔

مجھے کرمو کی خوشی بے حد عزیز ہے۔ لیکن اُس کے آنگن کے کونے میں دھری پتھر کی بڑی سی سِل کے نیچے دبی ننھی سی بے نام لاش مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ کیسا باپ تھا بیٹی کو نام تک نہ دے پایا۔

لیکن میں کہتی بھی تو کس سے کہ میں تو محض ایک گلی ہوں نا۔۔۔

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا تارا

ساغر صدیقی

عبدالہادی ناصر (نیویارک)

لاہور کے پُر رونق بازار انار کلی، شاہ عالمی، سرکلر روڈ کے آس پاس کی گلیوں میں سیاہ چادر کا لباس اوڑھے اور سر پر جٹیں بکھیرے بے نیازانہ چلتے یا سفر کرتے ہوئے ساغر صدیقی کو شہر کے باسیوں نے دیکھا ہوگا۔ اور پھر بہت سے لوگوں نے اس کی کسمپرسی پر بہت سی آرائیں بھی دی ہونگی۔ اور بہت سے لوگوں کو یہ علم بھی ہو گا کہ اُس نے چند روپوں کے عوض کئی مرتبہ کھاتے پیتے طالب علموں اور نام نہاد شائقین سخن کو غزلیں لکھ کر دی تھیں۔ لیکن لوگوں نے اس کے فن کے استحصال کو بھی فریب دینے کے انداز سے خوبصورت نام سے دیے۔ کوئی اس کو قلندر کہتا تو کوئی درویش کہتا۔ کوئی اُسے دیوانہ پکارتا، کوئی اسے فاترالعقل گردانتا۔ مگر یہ فاترالعقل ایسا تھا کہ کئی فرزانے اُس کے سامنے گردنیں جُھکا دیتے۔ یہ وہ فقیر تھا جس کو اپنی حاجت بیان کرنی نہیں آتی تھی۔ اس قلندر کو وطن کے غریبوں کا فکر تھا۔
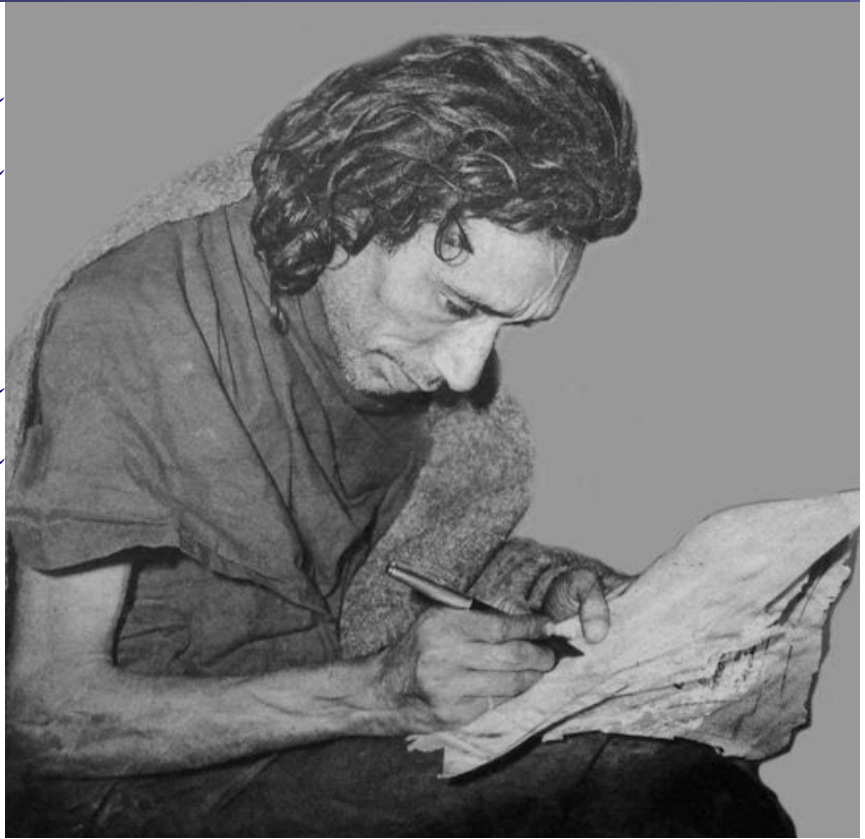
جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان میں مارشل لاء نافذ کیا اور زرعی اصلاحات نافذ کیں تو ہر شاعر اور ادیب کو یہ حکم ملا کہ وہ زرعی اصلاحات کے گیت گائے۔ ایک مشاعرہ لاہور کے اوپن ایر تھیٹر میں ہوا۔ جس میں سب شاعروں نے اس حکم کی بجا آوری میں زرعی اصلاحات کو سراہا۔ اور جب لوگ کہیں سے ساغر صدیقی کو ایک چادر میں لپیٹ کر لے آئے۔ اور انہیں

روشنی اور مائیکروفون کے سامنے کر دیا تو انہوں نے اپنی غزل کے اس شعر پر اپنی چادر اُتار کر میر مشاعرہ پر پھینک دی۔ کہ

مجھے وطن کے غریبوں کو ڈھانپنے کیلئے
قبائے خواجہ ءاقلیم کی ضرورت ہے

اور یہ مشاعرہ فرش سے اُٹھ کر عرش پر جا پہنچا۔ اس غزل میں اس وقت کے حکمران ٹولے کو ساغر صدیقی نے بتایا تھا کہ عوام کو اس نام نہاد زرعی اصلاحات کی ضرورت نہیں اور اصل میں اُنہیں کس کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ پوری انسانیت کا عاشق تھا۔ اسی لیے اپنی بے بضاعتی کے باوجود ہر جابر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا۔ اور وہ اس طرح سوچتا کہ

(1) سربلند اپنا لہو تھا سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتھیلی پر جو سر اپنا اُٹھا کر لے چلے

(2) بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغباں ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے

اے۔ حمید مشہور رومانی افسانہ نگار جو ساغر صدیقی کے بہت قریبی جاننے والے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک روز لاہوری دروازے کے باہر ایک مشہور ادبی پبلیشر کے ہاں بیٹھا ہوا تھا تو میں نے ایک گندہ کمبل دیکھا جو ایک خانے میں ٹھسا ہوا پڑا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کمبل کس کا ہے۔ تو اُس نے جواب دیا کہ یہ کمبل ساغر صدیقی کا ہے۔ روز ایک مرتبہ ضرور آتا ہے۔ اپنی غزل پانچ روپے کی اُس کے پاس بیچ جاتا اور اپنا انجکشن خریدتا ہے۔ یہ پبلشر اُسے 5 روپے ایک غزل کے ادا کرتا تھا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ لاہور میں بہت سے پبلشر تھے جنھوں نے اُس سے غزلیں لیں مگر ایک پیسہ ادا نہ کیا۔ انہوں نے ساغر کے دیوان پر دیوان چھاپے لیکن ساغر کو کچھ نہ دیا۔

ساغر صدیقی کیلئے لاہور شہر ایک جنگل تھا۔ جہاں تپتی سڑکوں کے پہاڑ تھے۔ یہ جو آپ ساغر کے دیوان دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن میں ساغر کی غزلوں کی لاشیں سجا کر رکھی گئیں ہیں۔ ساغر لاہور کی سڑکوں پر 25 سال ننگے پاؤں چلتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ان سڑکوں کا احترام کیا۔ اور اپنا جوتا اُن پر رکھنا مناسب نہ سمجھا۔

ساغر کے دوست بیان کرتے ہیں کہ ہم اکثر ساغر کے ابتدائی حالات کی کھوج میں رہتے کہ وہ کہاں پیدا ہوا؟ اُس کے ماں باپ کون تھے؟ اُس کی تعلیم کی ابتدا کیسے ہوئی؟ یونس ادیب جو ساغر کے دوست تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم سب دوست ساغر کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ساغر امرتسر سے پہلے انبالے، دہلی اور سہارنپور کے حوالے سے اپنے بارے میں بے ربط باتیں کر رہا تھا۔ شکنتلا کی باتیں کرتے کرتے رُک گیا۔ شکنتلا کے نام آنے پر شرما شرما جاتا اور اُس کی آنکھیں چمک چمک اُٹھتیں۔ پھر خود ہی بولا کہ ایک خیال کا عکس ہے جو کبھی کبھی ذہن میں جھلمل جھلمل کرنے لگتا ہے۔ میری زندگی زندان کی ایک کڑی ہے میں نہ جانے کہاں پیدا ہوا تھا۔ ماں کی مامتا، باپ کی شفقت بھائی کی محبت اور بہن کا پیار یہ سب چیزیں میرے لیے علی بابا چالیس چور کے پُراسرار غار کی کہانی ہے۔ جب اُس کے دوستوں نے مزید پوچھنا چاہا تو ساغر نے کہا۔ یاد آیا کہ 1936ء میں جب ذرا سوجھ بوجھ کا زمانہ آیا تو ایک ویران مکان کی افسردہ دیواروں کے ساتھ پڑے گلے ہوئے لکڑی کے صندوق میں دیمک چاٹتی کتابوں کو سب سے پہلے دیکھا۔ شاید اس کے پڑھنے والے 1857ء کی گھٹاؤں میں گم ہو چکے تھے۔ وہاں رات کی تاریکی میں ایک ڈیوٹ پر روشنی پھیلانے کی جستجو کرتا ہوا دیا میرے مشاہدے کی پہلی چیز تھی۔ اس گھر میں حاجی محمد حنیف اور حاجی محمد

حسین نام کے دو بزرگ آباد تھے۔ اُن کی پکی اور بیل بوٹوں والی قبروں کا کوئی پتھر شاید اب بھی وہاں کے قبرستان کے کسی کونے میں موجود ہو۔ میں نے اردو اس گھر میں پچاس سالہ بزرگ حبیب حسن سے پڑھی۔ یہیں مجھے شاعری کا شوق ہوا۔ میں نے بچپن غربت میں گزارا۔ اُس وقت کے تمام اردو روزناموں کا مطالعہ میرا شغل تھا۔ پھر میں دس بارہ سال کی عمر میں اپنے اُستاد حبیب حسن کے ساتھ امرتسر آگیا۔ امرتسر میں جامعہ السنہ ہال بازار میں بہترین درگاہ تھی۔ جہاں مشاعرے ہوتے تھے۔ اُن میں جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا۔ 1945ء میں کلیر کے مشہور عرس میں شریک ہوا۔ اُس وقت میں امرتسر کے ہال بازار میں شانہ سازی کا کام کرتا تھا۔ اور امرتسر کے باہر کلیر شریف کا میرا پہلا سفر تھا۔ اس دوران شاعر دوستوں کے ساتھ میں نے کاشانہ ادب کی طرف سے ایک مشاعرے میں شرکت کی اور پھر میں دہلی پہنچا۔ دہلی دیکھی، دہلی والے دیکھے اور مرقد غالب کی زیارت کی۔ شاعری کے اس مرشد کو استاد مانا اور امرتسر پہنچ گیا۔ امرتسر میں دوسری جنگ عظیم کی باغی آزاد ہند فوج کے تین جرنیلوں کے استقبال کیلئے جلیانوالہ باغ میں ایک بہت بڑے جلسے میں نظم پڑھی۔ 1947ء میں لاہور کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اور اب اپنے لیے بھی لاہور ہی کو منتخب کر چکا ہوں۔

یہ حیات کی کہانی ہے فنا کا ایک ساغر
تو لبوں کو مسکرا کے اس جام سے لگا لے

تقسیم ملک کے بعد ساغر لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ وہ دیو سماج پر ایک متروکہ بلڈنگ کے کمرے میں ٹھہرا۔ ادبی حلقوں میں اُس کی گہری جان پہچان ہو گئی تھی۔ شام کو انارکلی کے ہوٹلوں میں شاعر ادیب صحافی فنکار جمع ہوتے تھے۔ ممتاز ہوٹل میں ادیب شاعر جمع ہوتے تھے۔ مختلف علاقوں میں مشاعرے منعقد ہونا شروع ہوئے۔ ساغر نے شاعرانہ توانائیوں کے ساتھ لاہور میں قدم رکھا تھا۔ اپنے نغموں سے اس دھرتی کو سجانے کیلئے اُس کے پاس صرف خوبصورت جذبے تھے۔ فکر و خیال کے تجربے اور اُسکی فنکارانہ اظہار کی تڑپ ساغر کا کُل سرمایہ تھا۔ وہ توانا جذبوں اور مستقبل کے خوبصورت خاکوں کا خالق تھا۔ اُس نے بجا کہا تھا۔

ہم یہاں ساغر بنائیں گے نئی تصویر شوق
ہم تخیل کے مجدّد ہم تصور کے امام

اس شاعرانہ مزاج کے کھرے پن کی گونج دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ ادبی محفلوں میں اور مشاعروں میں آتا تو ان گنت آنکھیں اسے دیکھنے لگتیں۔ شاعرانہ سچائی سے سجی ہوئی اُس کی شخصیت عجیب شان سے ابھرتی چلی گئی۔ وہ احساس پر چھا جانے والے اپنے سرمدی ترنم سے ہمکلام ہوتا تو سماعتیں مدہوش ہو جاتیں۔ کسی نے ساغر سے کہا کہ تم کام دھندہ کیوں نہیں شروع کر دیتے۔ ساغر نے کہا۔

جنوں کے تجربوں کی نگہداری
بہ انداز فراست کر رہے ہیں

بے نواوں کا فقیر بن کر ساغر کس خوبصورتی سے اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔

جس زبان میں بے کسوں کی بات ہو
اس زبان میں گفتگو کرتے چلیں

ساغر صدیقی کی زندگی چاہے کتنی کسمپرسی میں گزری ہو۔ مگر اُس کی شاعری نے اُسے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں لا کھڑا کیا۔ اُس کی شاعری اور اُس کی فقیرانہ زندگی سے غیر ملکی

بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جاپان کا ایک طالب علم جس کا نام ''سویامانے'' اردو ایم۔ اے کرنے کیلئے اورینٹل کالج لاہور آیا۔ 'سویا مانے' نے پنجاب کی صوفیانہ ثقافت کا گہری دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ شاعروں کے مطالعہ نے 'سویامانے' کا تعارف ساغر صدیقی سے بھی کروایا۔ ساغر کی زندگی شخصیت اور تخلیقات پر اُنہیں جتنا مواد ملا اُس سے بہت متاثر ہوا۔ اور اُس نے عہد کیا کہ ساغر کے کلام کا جاپانی میں ترجمہ کروں گا۔ جن دنوں 'سویامانے' پاکستان میں جاپان کے سفارتخانہ میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے اُس وقت ساغر کی سولہویں برسی تھی۔ اُنہوں نے ساغر کی قبر پر میانی صاحب میں دیر تک وقت گذارا۔ اور ایک مضمون ساغر کی برسی پر پڑھا۔ جس کا موضوع تھا' تہی دستی کا شاعر'

اُس نے اپنے مضمون میں لکھا کہ جاپان میں پُرانے زمانے میں جاپان کے اکثر شعراء معمول کی زندگی چھوڑ کر کسی پہاڑ میں چھونپڑی بنا کر اپنی باقی ماندہ زندگی گزارتے تھے۔ شہر کی زندگی سے تھک کر پہاڑ پہ رہتے اور تمام مادی خواہشات سے اوپر اُٹھ جاتے تھے۔ یہی اُن کی زندگی کا مقصد ہوتا تھا۔ شہری زندگی سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا ایک تجربہ ہے۔ مگر ساغر صدیقی نے اپنی زندگی کو شہر میں رہتے ہوئے معمول کی زندگی سے دور رکھا۔ یہ ذرا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسی درویشانہ زندگی گزارنے والے کی کیسی نفسیات ہوگی۔ مدہوشی کی زندگی گزارنے کو انسانی کمزوری بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر جو شاعری ساغر نے کی ہے اُس میں اُس کا ذہن رسا نظر آتا ہے۔ ساغر صدیقی کے ہاں زندگی ایک درویشانہ بے نیازی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ کیفیت ان کی ذاتی زندگی کا کچھ نہ کچھ اثر ہو سکتی ہے۔ شہرت اور عزت اُن کیلئے اہم نہیں رہی۔ ان کی تمنا، آرزو اور خواہش جیسی ساری چیزیں شاعری سے ہی پوری ہو سکتی تھیں جن کا حصول عملی طور پر نہ ممکن رہا تھا۔ ساغر تو جیسے ایک بے نقاب آدمی بن کر رہے۔ اُن کی شاعری ایک تہی وستی کا گیت ہے۔ اور کیا خوب ہے کہ دنیاوی خواہشوں سے اُٹھ کر ہی آدمی اس انداز کی بات کر سکتا ہے۔

کچھ نہیں مدّعا فقیروں کا
درد ہے لا دوا فقیروں کا
اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں
کون ہے آشنا فقیروں کا
منزلوں کی خبر خدا جانے
عشق ہے رہنما فقیروں کا
منزلوں کی حدود میں ہونگے
کیا بتائیں پتہ فقیروں کا

ساغر کا کلام شاعروں میں مقبول ہونے والی شاعری کا ایک نمونہ ہے۔ سادہ کاری اور ابلاغ کا ایک ہنر مندانہ اظہار ہے۔ اُس کے اشعار شاعروں کی داد و بیداد تک محدود نہیں رہے۔ اُن میں یاد رہنے اور یاد آنے اور ضرب المثل کی طرح زبان پر آنے کی صلاحیت ہے۔ مثلاً ایسے اشعار کس کو بھول سکتے ہیں؟

یہ اور بات کہ منزل پہ ہم پہنچ نہ سکے
مگر یہ کم ہے کہ راہوں کو چھان بیٹھے ہیں

پھر اس شعر کی نازک مزاجی دیکھیے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ساغر کسی ذہنی مرض میں مبتلا تھا۔

میں نے پلکوں سے درِیار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

پھر ساغر کتنی وارفتگی سے کہتا ہے۔

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جُرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

پھر وُہ اپنی فرزانگی کا ذکر اس پیرایہ میں کرتا ہے۔

میں وہ آوارہ تقدیر ہوں یزداں کی قسم
لوگ دیوانہ سمجھ کر جسے سمجھاتے ہیں

ساغر لوگوں کو خوشیوں اور غموں کے تصادم میں کراہتے ہوئے دیکھ کر غمزدہ ہو جایا کرتا تھا۔ وہ ذہنی توانائی کے ہتھیاروں سے بھرپور مزاحمت کرتا۔ اپنی فکری دنیا کا دفاع کرتے ہوئے سارے غم اپنے اندر چھپالیتا۔ لیکن وہ اپنے اس مظہر کی خود دلیل بن جاتا۔

یہ واردات بھی اب دل پہ ہر روز ہوتی ہے
مسرتوں میں بھی ہم کو ملال ہوتا ہے
جواب نہ دے سکیں جس کا دو جہاں ساغؔر
کسی غریب کے دِل کا سوال ہوتا ہے

ساغر افسردہ چیزوں، بے لباس جسموں، مرجھائی ہوئی آنکھوں اور درد سے معمور دلوں کا ساتھی تھا۔ وہ سپاٹ تاریکیوں اور بے روح خاموشیوں میں بھی زندگی کی تلاش کا پیغام سناتا تھا۔

بجھا چراغِ نظر لٹ چکی ہے بزمِ خیال
چلو کہ صبح کے تارے سے کوئی بات کریں

ساغر اپنے معاشرے کی ستم ظریفی کا تذکرہ کرتا ہے اور اُس سے ستائے ہوئے بے بس انسانوں کا تذکرہ کر کے پر ملال ہو جاتا ہے۔ اور پھر اپنے ماضی میں جھانک کر اُس کا تجزیہ کرتا ہے کہ ماضی کتنا تابندہ تھا۔

برق گرنے لگی پھول جلنے لگے
پھر تماشا ہلاکت کا ہونے لگا
دیکھ کر آدمیت کو وحشت زدہ
ایک شاعر کا دِل آج رونے لگا

عہدِ ماضی کی تصویر آنکھوں میں ہے
کس قدر مطمئن دورِ ایّام تھا
زندگی کی صراحی میں تھے قہقہے
وقت کے ہاتھ میں اَمن کا جام تھا

ساغر مفلسوں کے درد میں شراکت داری کا سفیر تھا۔ اُن حرماں نصیبوں کی محرومیوں کا اندازہ کر کے اس کا دل بے قرار ہو جایا کرتا۔ ساغر گلہ کرتا۔

اِک ننھا سا آرزو کا دِیا
ضوفشاں تھا بہار سے پہلے
لُٹ گئی دِل کی زندگی ساغر
دِل جواں تھا بہار سے پہلے

ساغر اپنے شعر و سخن کے خزانہ کو کتنے حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔

آپ اپنے فن سے ناواقف ہے ساغر کی نظر
لعل و گہر کی ضیاؤں سے خزانہ بے خبر

ساغر اپنی زندگی کی نے بسی کو اس پیرائے میں بیان کرتا ہے۔

قریبِ دار کٹا دِن تو رات کانٹوں پر
گزار دی ہے کسی نے حیات کانٹوں پر

نہ کوئی پھول نہ ساغر نہ مہتاب نہ تو
بجھا ہوا سا شبستاں ہے زندگی اپنی

فغاں ہے درد ہے سوز و فراق و داغِ الم
ابھی تو گھر میں بہت مہربان بیٹھے ہیں

اُلجھی تھی عقل و ہوش میں ساغر رہِ حیات
میں لے کر تیرا نام فنا سے گزر گیا

زندگی اور موت میں کتنا فرق ہے کتنا فاصلہ ہے ساغر سے بہتر کوئی اس حسی تجربے سے آشنا نہیں۔

چراغ زندگی کو ایک جھونکے کی ضرورت ہے
تمہیں میری قسم پھر ذرا دامن کو لہرانا

ساغر غریب کے پیمانہ غم کو محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب غم چیخ اُٹھے تو پھر اُمید کی کرن نظر آتی ہے۔

دست سائل میں اگر کاسۂ غم چیخ اُٹھے
تب کہیں جا کر ستاروں سے ضیاء ملتی ہے

کاسۂ غم کی ترکیب کتنی خوبصورت استعمال کی۔ کیا ان شعروں کو پڑھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ساغر ذہنی لحاظ سے عاری تھا۔ اس کو دیوانہ سمجھ کر معاشرہ اُس سے لاتعلق رہا۔ ساغر کا سماجی شعور کس منزل پر تھا۔ اس شعر سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

غم زندگی کہاں ہے ابھی وحشتوں سے فرصت
تیرے ناز اُٹھا ہی لیں گے ابھی زندگی پڑی ہے

یاروں نے ساغر سے کہا کہ ساغر صاحب گھر بنایے۔ ساغر نے کہا کہ فقیروں کا گھر تو ساری کائنات ہے۔ مگر یار کب مانتے تھے۔ ساغر نے موہنی روڈ پر ارائیں بلڈنگ کے قریب گھر بنا لیا۔ گھر کیا تھا ایک کوٹھری تھی۔ اور ایسی کوٹھری کہ دن کو بھی شب کی سیاہی کا سماں تھا۔ اُس کوٹھری میں ایک پھٹی ہوئی دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک ٹوٹا ہوا گلاس کچھ بکھرے ہوئے کاغذ ایک اینٹ پر چار مورتیاں پڑی تھیں۔ لوگوں میں چہ میگویاں ہونے لگیں۔ کوٹھری کے مالک کو پریشان کیا جانے لگا۔ پھر کیا ہوا کہ ایک دن فقیر کا سامان کوٹھری کے باہر پڑا ہوا تھا۔ فقیر اُس وقت اپنے گھر سے دور کسی جگہ اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو کیا خبر تھی کہ اس شہر کے باسی اُس سے یہ سلوک کریں گے۔ اُس نے دری لپیٹی جھولی میں گلاس اور ماچس ڈالی ایک لمحے کیلئے اُس کا چہرہ متردد ہو گیا۔ اور حاضرین کو سلام کر کے نہ جانے کس منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا۔ اس تجربے کے بعد ساغر نے کبھی گھر نہیں بنایا۔ اور ساری زندگی زیر دیوار اور فٹ پاتھوں پر بسر کر کے راہی ملک عدم ہوا۔ یہ کونسا معاشرہ تھا جس نے اس فقیر پر ظلم ڈھائے اُس کی بیچارگی پر پھبتی اُڑائی لیکن اُن لوگوں کو اس فقیر کے اُس کلام کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ کہ اُس کے کلام نے اُس کو زندہ کر دیا ہے۔ اور اُسے دربار سخن میں وُہ مقام عطا کیا۔ جو کم لوگوں کو میسر آتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد ہر سال اُس کی برسی منائی جاتی ہے۔ لوگ دور نزدیک سے آ کر اُس کے کلام پر تبصرے کرتے ہیں۔ جب کہ ان لوگوں نے اس کی زندگی میں اُسے فقیر، دیوانہ، پاگل کے خطابات سے نوازا۔ اور اُس سے منہ پھیرا کہ یہ فقیر کہیں اُن سے کچھ مانگ نہ لے۔ آج جب یہ لوگ اُس کی قبر کی زیارت کرنے جاتے ہیں اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ کیا ساغر کی روح کرب کر ساتھ یہ نہ کہتی ہو گی۔

جب مر گئے تو آئے ہمارے مزار پر
پتھر پڑیں صنم تیرے ایسے پیار پر

یہ وہ فقیر تھا جس نے پلٹ کر کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ نہ ہی اُس کی زبان سے کچھ فحش بات نکلی، ہر ایک سے احترام سے پیش آتا۔ طمع

اُس کے قریب تک نہ پھٹکی۔ وہ اپنے مقام کو بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔

ساغر کا دوست یونس ادیب کہتا ہے کہ ایک دِن دوپہر کے بعد ایک نیلے رنگ کی لمبی کار ساغر کے پاس آکر رُکی۔ اُس میں سے ایک بوڑھی عورت اور ایک نوجوان لڑکی کار سے باہر نکلیں۔ جو کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ چند قدم کے فاصلے پر آ کر رُک گئیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ بوڑھی خاتون اور نوجوان لڑکی آگے آئیں اور ساغر کے پاس پیروں کے بَل زمین پر بیٹھ گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں سے ساغر کو کوئی ولی اللہ سمجھ لیا ہے اور کوئی آرزو لے کر آئی ہیں۔ ساغر پہلے ہی سمجھ گیا تھا اور وہ اپنا بوری بستر سنبھال رہا تھا۔ بوڑھی عورت نے چار سو روپے پرس میں سے نکال کر ساغر کے سامنے رکھ دیئے۔ ساغر اس طرح چونک پڑا جیسے اسے بچھونے کاٹ لیا ہو۔ یہ کیا ظلم ہے یہ ظلم نہ کرو۔ ساغر نے کہا۔ نہیں بابا جی! اسے قبول کریں۔ اور دُعا کریں کہ میری بیٹی کا گھر آباد ہو جائے۔ اس کا شوہر اسے آباد نہیں کرتا۔ بڑی دُکھی ہے میری بیٹی۔ آپ دُعا کریں۔ ساغر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بی بی میں تو کچھ بھی نہیں۔ یہ روپے اُٹھا لو۔ فقیر کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہیں بابا! بہت دُکھی ہوں میری آس نہ توڑیں بوڑھی عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ بس دُعا کریں۔ ساغر نے کہا میں دُعا کروں گا۔ تمہاری بیٹی دُکھی ہے۔ یہ سُن کر میں دُکھی ہو گیا ہوں۔ یہ روپے اُٹھا لو۔ میں دُعا فروش نہیں۔ ویسے تمہاری بیٹی سدا خوش رہے سکھی رہے۔ یہ کہہ کر ساغر نے اپنی چادر جھاڑی اور روپے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ساغر کہتا ہے۔

جس زبان میں بیکسوں کی بات ہو
اُس زبان میں گفتگو کرتے چلیں

ساغر ایک دن کسی کھوکھے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کسی راہ گیر نے اُس کو گداگر سمجھ کر ایک چوّنی اُس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ساغر نے عجیب انداز سے راہ گیر کو دیکھا اور چوّنی سڑک پر پھینک دی۔ اور کہا کہ فقیر کی جھولی میں اپنے سانپ کو کیوں پھینکتے ہو؟

اخبار مارکیٹ والے اپنی مارکیٹ میں کسی نہ کسی بہانے ساغر کو کھینچ لاتے تھے ایک مرتبہ جلسے میں "اخبار فروش" کے عنوان سے نظم پڑھی۔ اخبار فروشوں نے نوٹوں کی بارش کر دی۔ چار پانچ نوٹ مداحوں سے لیے اور باقی وہیں چھوڑ کر یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا کہ اب فقیر کا دامن بھر گیا ہے۔

فلموں والے فٹ پاتھ پر آکر ساغر سے گانے لکھواتے اور اس کے عوض پانچ دس روپے معاوضہ دیتے۔ اسی طرح کسی فلم والے نے ساغر سے گیت لکھوایا اور دس کا نوٹ دیا۔ ساغر نے اُس دس روپے کے نوٹ کو گول کر کے اور اُس میں تمباکو بھر کر اُس کے سامنے پینے لگ گیا۔

ساغر کا دوست یونس ادیب لکھتا ہے کہ ساغر نے مرنے سے تین دن پہلے مجھے کہا کہ میں نے آج اپنی کالی چادر اتار دی ہے اور یہ سفید کفن نما کرتہ زیب تن کر لیا ہے۔ اُس نے کھانسی کے ساتھ بلغم تھوکی اور کفن نما کرتے کو چھو کر بولا کہ مقتل کی طرف جانے کی گھڑیاں آ گئیں ہیں۔ اور میں نے کفنی پہن لی ہے۔ اور اُس نے اپنی بے نور آنکھوں سے عینک اُتار پھینکی اور کہا کہ اب مجھے کسی چیز کو دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ اب جا بھی کہاں سکتا ہوں۔ صرف چولا بدلنے گیا تھا۔ اب تو میں نے سب تیاریاں مکمل کر لیں ہیں۔ اور یہ کہہ کر لوہاری کے اندر اپنے لرزیدہ جسم کو کھینچ کر لے گیا۔ صبح لوہاری

گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مکتبہ جدید کے سامنے راہ گیر اُس کو دیکھ کر آگے نکل جاتے تھے۔ سارا شہر اُس کو خون تھوکتے دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے رومن اکھاڑے میں جمع ہوں۔ اور خونی منظر دیکھ کر تالیاں بجا رہے ہوں۔ جس میں ساغر کفن پہنے بوجھل سانسوں کے ساتھ اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ اُس کے کفن پر خون کے دھبے اس طرح جگمگا رہے تھے جیسے خنجر بکف جلاد اس پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ اُس نے بند ہوتی ہوئی آواز میں کچھ کہنا چاہا۔ تو اُس کے منہ سے خون نکل کر اُس کے ہونٹوں پر پھیل گیا۔ اُس نے سفید قمیص کی آستین سے خون پونچھ کر پھر دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی تو خون کی لکیریں اُس کی کفن نما قمیص پر بہنے لگیں۔

اپنے ہی خون میں شرابور ساغر صدیقی اس ہنستے بستے شہر میں مقتل کا نظارہ بنا رہا۔ اُس نے اپنی کالی چادر اُتار کر اپنے ہاتھ سے سفید کفن نما قمیص پہنی۔ شاید اُسے یہ بھی یقین ہو کہ جس معاشرہ نے اس کا کچھ نہیں کیا، کیا پتہ کہ یہ معاشرہ اُس کو کفن پہنا کر دفن کرے گا یا نہیں۔ ۔۔یوں ساغر صدیقی جو طمع وستائش سے بے نیاز تھا۔ جس نے عمر بھر حسن و پیار اور رحم کے گیت تراشے تھے۔ ہمیشہ کیلئے بغیر کسی کے احسان مند ہونے کے اپنی حقیقی منزل پر پہنچ گیا۔ اسے کسی نے کفن پہنایا اور اُسے کون قبرستان لے گئے یہ شکستِ ساغر کی آخری گمشدہ کڑی ہے۔

ساغر کے کتبہ پر یہ عبارت کندہ ہے کہ

”عاشق کو سجدہ کرنے والے کو اس بات سے
کوئی سروکار نہیں کہ اُس کی پگڑی کہاں گری ہے
اور اُس کا سر محبوب کے قدموں پر کس انداز سے گرتا ہے“

ساغر کے کسی مدّاح نے اس کے کتبے پر یہ الفاظ بھی کندہ کرائے ہیں کہ ساغر کا قاتل یہ معاشرہ ہے۔ اور نیچے یہ شعر درج ہے۔

سُنا ہے اب تلک واں سونے والے چونک اُٹھتے ہیں
صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گزر آئے

(تاریخ وفات: 19 جولائی 1974ء)

لاہور کا ایک جوان سال شاعر ظہیر احمد ظہیر جو ساغر صدیقی سے اپنی اصلاح کرواتا تھا۔ اور ساغر کا مدّاح تھا۔ اس کے پاس ساغر کی ایک امانت تھی وہ ساغر کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا کتبہ تھا۔ ساغر کی وفات کے بعد یونس ادیب کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کل رات ساغر خواب میں ملے تھے اور کہتے تھے کہ میرا لکھا ہوا کتبہ یونس ادیب کو دے دو لہٰذا میں یہ اُن کی امانت آپ کو دینے آیا ہوں۔ کتبہ یہ تھا۔

یاد رکھنا ہماری تربت کو
قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

بشکریہ ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ۔غالب نمبر

تصنیفاتِ غالب

مالک رام

۱۔دیوان اُردو

میرزا کو اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر ناز تھا اور وہ اُردو کلام کو چنداں وقعت نہیں دیتے تھے۔اسے وہ اپنے لیے باعثِ ننگ اور اپنے "نخلستانِ فرہنگ" کا "برگ وثم" کہتے رہے۔مگر اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے ابتدا اردو ہی سے کی تھی اور آج ان کی شہرت کا ایوان اُردو دیوان ہی کی بنیادوں پر قائم ہے۔

اردو میں اپنی "بیدلانہ" روش وہ غالباً مولوی فضل حق کی روک ٹوک پر کلکتے جانے سے پہلے ہی ترک کر چکے تھے۔یہاں کلکتے میں ان کی ملاقات مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی اور ان کی فرمائش پر انہوں نے اردو اور فارسی کلام کا مختصر انتخاب کیا اور "گل رعنا" اس کا نام رکھا[۱]۔اسی زمانے میں انہوں نے صرف اردو کلام کا ایک مفصل انتخاب بھی مرتب کیا جو متداول دیوان کی اولین یا ابتدائی شکل کہی جاسکتی ہے اس کے لئے علیحدہ دیباچہ بھی لکھا[۲]۔یہی انتخاب بعد کے دوسرے کلام کے اضافے کے ساتھ پہلی مرتبہ شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں چھپ کر شائع ہوا۔یہ ایڈیشن سرسید احمد خاں مرحوم کے بھائی سید محمد خاں بہادر کے قائم کردہ "مطبع سید الاخبار" میں چھپا تھا[۳]۔یہ نسخہ پندرہ سطری سطر کے ۱۰۸ صفحات پر محیط ہے اور اس میں ۱۰۹۵ شعر ہیں۔اس کے شروع میں غالب[۴] کا اپنا فارسی دیباچہ اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ ہے جو انہوں نے ۱۲۵۴ھ میں لکھی تھی۔اس میں شعروں کی

تعداد ۱۲۷۸ بتائی گئی ہے۔ اس تقریظ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ دیوان ۱۲۵۴ھ میں مرتب ہو چکا تھا اور دوسری یہ کہ اس وقت اس میں ۱۰۷۰ شعر تھے۔ گویا جب دیوان تین برس بعد ۱۲۵۷ھ شائع ہوا تو اس میں صرف ۲۵ شعروں کا اضافہ ہوا۔

اس ایڈیشن کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ ایک کرم خوردہ نسخہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس تھا اور خدا معلوم اب کہاں ہے۔ ایک غالباً خان ابو محمد مرحوم کے خاندان میں ہے۔ ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری رام پور میں اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ (دلی) کے کتاب خانے میں ہے۔

دیوان اردو کا دوسرا ایڈیشن جمادی الاول ۱۲۶۳ھ (مئی ۱۸۴۷ء) میں منشی نورالدین احمد لکھنوی کے مطبع دارالسلام حوض قاضی، دہلی میں چھپا۔ اس کے شروع اور آخر میں بھی بالترتیب میرزا کا دیباچہ اور نیرّ رخشاں کی تقریظ ہے۔ اس میں ۹۸ صفحے اور ۱۱۱۱ شعر ہیں۔

مئی ۱۸۵۷ء میں غدر سے شاید دو ہی ایک دن پہلے میرزا نے دیوان کا ایک نسخہ خوشخط لکھوا کر نواب یوسف علی خاں فردوس مکان کی خدمت میں بھیجا تھا[۴]۔ جب وہ جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ان سے کہا کہ رام پور والے نسخے کی ایک نقل لے کر مجھے بھیج دیئے گا۔ یہ اس لئے کہ ان کا اپنا نسخہ غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ رام پوری میں میرزا کو میرٹھ کے ایک شخص عظیم الدین احمد کا خط ملا کہ میں آپ کا اردو دیوان چھاپنا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت دی جائے۔ میرزا چونکہ اس شخص کو جانتے نہیں تھے، اس لئے انہوں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر واپسی پر جب وہ میرٹھ میں نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کے پاس ٹھہرے، تو انہوں نے عظیم الدین احمد کی سفارش کی اور کاپیاں دیکھنے کی خدمت اپنے ذمے لی۔ اس پر میرزا نے دلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں سے قلمی دیوان لے کر میرٹھ بھیج دیا۔ تھوڑے دن بعد منشی شیونرائن مالک مطبع مفید خلائق آگرہ نے انہیں لکھا کہ آپ نے گھر کا مطبع چھوڑ کر دیوان میرٹھ کیوں بھیجا ہے۔ تو انہوں نے اسے بہ اصرار عظیم الدین احمد سے واپس منگوا کر منشی شیونرائن کے پاس آگرے بھیج دیا[۵]۔ دیوان ابھی آگرہ میں چھپنا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ معلوم نہیں کیوں انہوں نے مطبع احمدی واقع شاہدرہ دہلی کے مالک محمد حسین خاں تحسین کو اس کے چھاپنے کی اجازت دے دی۔ مگر یہ ایڈیشن اتنا غلط چھپا کہ میرزا نے خود ایک نسخے کی نظر ثانی و تصحیح کر کے اسے مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مذکور کو دیا جنہوں نے اسے محمد عبد الرحمن خاں مہتمم مطبع نظامی کانپور کے پاس بھیج دیا[۶]۔ مطبع احمدی والے نسخے پر تاریخ ۲۰ محرم الحرام ۱۲۷۸ھ (۲۹/ جولائی ۱۸۶۱ء) درج ہے اور مطبع نظامی والے میں ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) گویا اس ایک برس میں دیوان کے دو ایڈیشن چھپے۔

مطبع احمدی والے نسخے میں ۸۸ صفحے اور ۱۷۹۶ شعر ہیں۔ اس کے مقابلے میں مطبع نظامی کانپور کے نسخے میں ۱۰۴ صفحے ہیں اور شعر ۱۸۰۲۔

اس دوران میں منشی شیونرائن بھی دیوان کو چھاپنا شروع کر چکے تھے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ دیوان دلی اور کانپور دو جگہ سے شائع ہو گیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سردست اسے ملتوی کر دیا اور آخر کار اسے اگلے برس ۱۸۶۳ء میں پورا کر کے شائع کیا۔ وہ غالباً دیوان کے ساتھ میرزا کی تصویر بھی چھاپنا چاہتے تھے۔ چنانچہ غالبؔ نے اپنی تصویر بھی ان کی نذر کی تھی۔ مگر ان کے شائع

کردہ دیوان کے ساتھ تصویر نہیں چھپی ہے اس ایڈیشن میں ۱۷۹۵ شعر ہیں اور ۱۴۶ صفحے۔

غالبؔ کی زندگی میں ان کے علاوہ اور کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

۲۔ عوُدِہندی

میرزا ایک مدت تک اپنے خطوط فارسی زبان میں لکھتے رہے۔ لیکن ۱۸۴۸ء کے شروع میں، بلکہ عین ممکن ہے کہ اس سے بھی کچھ پہلے، انہوں نے عام طور پر فارسی میں خط لکھنا ترک کر دیا اور اس کے بعد خاص حالات کے سوائے آخر تک وہ اُردو ہی لکھا کیے۔

میرزا کے اردو خطوط جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے ممتاز علی خاں صاحب میرٹھی کو ہوا۔ انہوں نے مارہرہ کے چودھری عبد الغفور سرورؔ سے کہا کہ آپ وہ خطوط عنایت فرمائیں جو آپ کے پاس ہیں۔ سرورؔ نے نہ صرف اپنے خط ہی دیئے بلکہ وہ بھی جو صاحب عالم اور شاہ عالم صاحبان کے نام آئے تھے۔ ان ۳۱ خطوں پر ایک دیباچہ لکھا جس میں تاریخ کا قطعہ ہے۔

انشا مملو بصد مطالب لکھی
یعنی پے دوستانِ طالب لکھی
موسوم کیا جو مہر غالبؔ سے سرورؔ
تاریخ بھی اس کی مہر غالبؔ لکھی[۷]

اور یہ سارا مجموعہ جناب ممتاز علی خاں کے حوالے کر دیا۔ بعد کو ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ اگر کوشش اور تلاش کی جائے تو بعض دیگر حضرات سے بھی خط بہم پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سرورؔ والے مجموعے کی اشاعت ملتوی کر دی اور خواجہ غلام غوث خاں بیخبرؔ کی مدد اور وساطت سے مزید ۱۳۷ خط جمع کیے۔ ان خطوط کے علاوہ انہوں نے چند تقریظیں اور نثریں بھی حاصل کیں۔ ان سب کا مجموعہ عود ہندی کے نام سے اول بار مطبع مجتبائی۔ میرٹھ سے ۱۰/رجب ۱۲۸۵ھ (۲۷/اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو (یعنی میرزا کی وفات سے تقریباً چار مہینے پہلے) شائع ہوا، اگرچہ تمام مسودہ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو کر مطبع میں دیا جا چکا تھا[۸]۔

یہ نسخہ ۱۸۸ صفحوں پر چھپا ہے۔ اس کے شروع میں منشی ممتاز علی خاں کا دیباچہ اور آخر میں حکیم غلام مولا صاحب قلق میرٹھی کی تقریظ اور مختلف اصحاب کے چار تاریخی قطعے ہیں۔ اس کی قیمت ایک روپیہ فی نسخہ تھی۔

۳۔ اُردوئے معلّٰی

عودہندی کی ترتیب ۱۸۶۱ء میں شروع ہوئی تھی۔ مگر خطوں کے جمع کرنے کا کام اتنا آہستہ آہستہ ہوا کہ اس کے چھپنے میں بہت دیر لگ گئی۔ دوستوں کی طرف سے تقاضا شروع ہوا تو میرزا نے غلام غوث خاں بیخبرؔ کو لکھا کہ آپ کے پاس جتنے خط ہیں۔ ان کی نقل مجھے بھیج دیں۔

لکھتے ہیں[۹]۔

”اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں۔ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں گے۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں۔ وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔“

حقیقت یہ ہے کہ جب منشی ممتاز علی خاں کی طرف سے خطوط کی اشاعت میں غیر معمولی دیر ہوئی تو میرزا نے خیال کیا کہ

انہوں نے چھاپنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ ادھر ان کے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہرؔ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ انہوں نے بیگاری کے ایام کا یہ مشغلہ اختیار کیا کہ اکمل المطابع کے مہتمم میر فخر الدین اور منشی بہاری لال مشتاق کی مدد سے خطوط جمع کرنا شروع کیے تاکہ انہیں اس مطبع میں چھاپا جائے۔ انہوں نے میرزا سے بھی مدد مانگی۔ چنانچہ اسی سلسلے میں میرزا نواب علاؤالدین احمد خاں کو اپریل یا مئی ۱۸۶۳ء میں لکھتے ہیں:[۱]

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند اصحاب میرے مسودات اُردو کے جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف وجوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا۔ وہ جہاں بھیجنا ہوا وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اس کو دے دو گے۔ تو موجب میری خوشی کا ہو گا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ میرزا نے آپ بھی دوستوں سے رقعات جمع کر کے مرتب کے پاس بھیجے تھے۔ بعض اور خطوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ گویا وہی کام جو پانچ برس پہلے انہوں نے منشی شیو نرائن کے کہنے پر نہیں کیا تھا اور یہ کہہ کر ٹال دیا تھا[۱]:

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہو گا۔ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔"

اب خود سرگرمی سے اس میں حصہ لینے لگے۔ یہ مجموعہ ۶/ مارچ ۱۸۶۹ء (۲۱ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو اُردوئے معلٰی کے نام سے چھپا۔ افسوس کہ میرزا کو اس کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ وہ اس سے اُنیس دن پہلے فروری میں وفات پا چکے تھے۔ میرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ نے تاریخ کہی۔

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا
لب پہ نالوں کا اژدھام ہوا
صدمۂ مرگ حضرتِ غالبؔ
سبب رنج خاص وعام ہوا
ہے یہی سالِ طبع وسالِ وفات
آج اون کا سخن تمام ہوا
۱۲۸۵ھ

یہ اُردوئے معلٰی کا پہلا حصہ تھا۔ اس میں ۴۶۴ صفحے ہیں جن میں تین صفحے کا غلط نامہ بھی شامل ہے۔ اسی مطبع سے یہ حصہ دربارہ یکم رجب ۱۳۰۸ھ (۱۱/ فروری ۱۸۹۱ء) کو شائع ہوا۔

حصہ دوم ابھی تک نہیں چھپا تھا۔ آخر کار اپریل ۱۰۹۹ء میں مولانا حالیؔ کی فرمائش پر مولوی محمد عبد الاحد نے اپنے مطبع مجتبائی، دہلی میں پہلی دفعہ دونوں حصے یک جا چھاپے۔ دوسرا حصہ مولانا حالیؔ ہی نے مرتب کیا تھا۔ انہوں نے اس میں جگہ جگہ ضروری حاشیوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔ یہ حصہ ۵۶ صفحوں کو محیط تھا۔

۱۹۲۲ء میں شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے ایک ایڈیشن کریمی پریس لاہور میں چھاپ کر شائع کیا۔ اس میں پہلے دو حصوں کے علاوہ آخر میں ایک ضمیمہ بھی ہے۔ خود ناشر نے حصہ دوم

کے آغاز میں دو خطوں کا اضافہ کیا۔ جو میرزا نے سجاد میرزا مرحوم (خلف ناظر حسین میرزا) کے نام لکھے تھے اور انہیں مکتوب الیہ کے خاندان (آغا محمد طاہر مرحوم) سے دستیاب ہوئے تھے۔ یہ ضمیمہ مسٹر شیر محمد سرخوش نے مرتب کیا تھا۔ انہوں نے اس کا دیباچہ بھی لکھا۔ اس ضمیمے میں ۲۳ خط ہیں۔ لیکن واقع یہ ہے کہ یہ سب خط جو قدر بلگرامی (۲۲) اور لطیف احمد بلگرامی (۱) کے نام ہیں۔ اس سے پہلے اُردوئے معلی (علیگڑھ) کے دسمبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں مولوی علی اصغر بلگرامی نے شائع کیے تھے۔ سرخوشؔ صاحب نے وہیں سے نشان دہی کیے بغیر نقل کر لیے ہیں۔

۴۔ مکاتیب غالبؔ

میرزا کی دربار رام پور سے بارہ برس تک خط و کتابت رہی۔ جنوری ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۶۵ء تک نواب فردوس مکان کے ساتھ اور اس کے بعد اپنی موت تک نواب خلد آشیاں کے ساتھ۔ خوش قسمتی سے ان میں سے اکثر خطوط ریاست رام پور کے دار الانشاء میں محفوظ تھے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ ناظم کتاب خانۂ رام پور نے انہیں "مکاتیب غالبؔ" کے عنوان سے مرتب کر کے پہلے مرتبہ ۱۹۳۷ء میں شائع کیا۔ اس پہلے ایڈیشن میں کل ۱۱۵ خطوط تھے، ۱۰۷ دونوں والیانِ ریاست کے نام اور ۸ رام پور کے بعض اور حضرات کے نام ان پر مرتب نے ایک مبسوط دیباچہ لکھا، آخر میں سیر حاصل حواشی بڑھائے، نیز جگہ جگہ حاشیے میں ان خطوط کی نقل دی، جو ریاست کی طرف سے میرزا کے خطوں کے جواب میں بھیجے گئے تھے جس سے کتاب اور بھی مفید ہو گئی۔ اس کے بعد بھی اس مجموعے کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور خطوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ مؤلف نے اس میں حواشی بھی بڑھائے اور دیباچے کو بھی مفصل کر دیا۔ یہ ساتویں بار ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۳۰ مکتوبات شامل ہیں، ۱۱۷، دونوں نواب صاحبان کے نام اور ۱۳ بعض دوسرے اصحاب رام پور کے نام۔ اس کے بعد چند اور خط بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

۵۔ نادراتِ غالبؔ

غالبؔ نے جو خط منشی نبی بخش حقیرؔ اکبر آبادی کے نام لکھے تھے، وہ میر مہدی مجروحؔ اور میر افضل علی عرف میرنؔ صاحب نے جمع کیے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ مجموعہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔ میرنؔ صاحب کے نواسے جناب آفاق حسین آفاقؔ دہلوی نے مبسوط دیباچے اور حواشی کے ساتھ اسے نادرات غالبؔ کے نام سے "ادارۂ نادرات کراچی" کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔ (۱۹۴۹ء)۔ اس میں ۱۷ خط حقیرؔ کے نام ہیں [۱۱]۔ ۱۱ اور دو ان کے صاحبزادے منشی عبد اللطیف کے نام۔ ان میں سے ایک خط حقیرؔ کے نام کا اور ایک خط منشی عبد اللطیف کے نام کا، اس سے پہلے اُردوئے معلی میں چھپ چکے ہیں۔

یادگار غالب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مولانا حالیؔ نے یہ کتاب لکھی ہے، تو یہ مجموعہ ان کے مد نظر تھا۔

۶۔ غالبؔ کی نادر تحریریں

پچھلے بیس پچیس برس میں غالبؔ کے متعدد خط اور متفرق تحریریں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں۔ یہی تمام چیزیں خلیق انجم صاحب نے جمع کر کے اس عنوان سے یک جا شائع کرا دی ہیں (فروری ۱۹۶۱ء) انہوں نے شروع میں ایک دیباچہ لکھا اور آخر میں حواشی کا بھی اضافہ کیا ہے۔ کتاب اغلاط سے مبرّا نہیں لیکن یہ ایک مفید کام ہوا ہے۔

ابھی خطوط کی خاصی تعداد غیر مطبوعہ ہے منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس معقول ذخیرہ تھا[۱۳]۔ انہوں نے تمام خطوط کو اہتمام سے مرتب کر کے چھاپنا شروع کیا تھا اور خطوط غالبؔ کی پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکیڈیمی، الٰہ آباد کی طرف سے شائع ہوئی۔ انہوں نے اپنے مجموعے میں تمام وہ خطوط، جو اُردوئے معلی اور عودِ ہندی اور مکاتیب غالبؔ میں شائع ہو چکے ہیں، یا اور بھی جن تک ان کی دسترس ہو سکی شامل کر لیے تھے اس کی دوسری جلد شائع نہیں ہوئی تھی کہ ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ حال میں انجمن ترقی اُردو علی گڑھ نے اس کی پہلی جلد دوبارہ شائع کی ہے۔ اس ایڈیشن میں نادراتِ غالبؔ والے خط بھی شامل ہیں۔ خطوط کی دوسری جلد بھی شائع ہونے والی ہے۔ اس میں بہت سے خطوط نئے ہیں۔

۷۔ نکاتِ غالبؔ و رقعاتِ غالبؔ

جس زمانہ میں میجر فلر پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ انہوں نے علوم مشرقیہ کی ترقی کے لئے بہت کوشش کی تھی۔ کئی حضرات کو اپنے پاس لاہور بلوایا اور ان سے کتابیں لکھوائیں۔ جو نہیں آسکتے تھے، ان سے فرمائش کر کے کتابیں تصنیف کرائیں۔ جو لوگ ان کی دعوت پر لاہور پہنچے، ان میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب بھی تھے۔ موصوف نے میجر فلر کے حسب الحکم میرزا سے طلبہ کے لئے فارسی زبان کی صرف کے قواعد لکھنے کی درخواست کی۔ اس پر میرزا نے دو مختصر رسالے مرتب کیے۔ نکات غالبؔ میں یہ قواعد ہیں جو اردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اس میں ۲۰ صفحے ہیں، رقعاتِ غالبؔ میں ان کے ۱۵ فارسی خط ہیں جو انہوں نے پنج آہنگ کے آہنگ پنجم سے انتخاب کیے ہیں۔ اس میں صرف ۱۶ صفحے ہیں گویا دونوں چیزیں ۳۶ صفحوں کو محیط ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن جس میں صرف پانسو نسخے تھے۔ فروری ۱۸۶۷ء میں محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجیؔ، دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد دوبارہ رسالہ نہیں چھپا۔

۸۔ قادر نامہ

میرزاؔ نے عارفؔ کے دونوں بچوں باقرؔعلی اور حسین علی خاں کی تعلیم کے لئے آٹھ صفحے کا ایک مختصر منظوم رسالہ قادر نامہ تصنیف کیا تھا اس میں خالق باری اور آمد نامہؔ کے طرز پر اردو فارسی کے ہم معنی الفاظ ہیں[۱۴]۔ چونکہ پہلا شعر لفظ قادر سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا نام قادر نامہ رکھا گیا۔ شعر اوّل ہے۔

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا

ہے نبی مرسل پیمبر رہنما

کل اشعار کی تعداد ۱۳۷ ہے۔ اس میں بارہ شعر دو غزلوں کے بھی شامل ہیں جو قادر نامہ ہی کا حصہ ہیں۔ آخر میں ۴ شعر کا ایک قطعہ ہے۔

قادر نامہ کا پہلا ایڈیشن مطبع سلطانی (قلعہ) دہلی سے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن چھپے ہیں۔ پہلے ایڈیشن ہی کو دوبارہ بڑے اہتمام سے مرتب کر کے مکتبۂ نیا راہی کراچی سے شائع کیا گیا ہے۔ (۱۹۵۹ء) قادر نامہ کا ایک ایڈیشن ۱۸۶۴ء میں مجلس پریس دہلی میں چھپا تھا۔ اس کا ایک نسخہ کتاب خانۂ رضائیہ رام پور میں موجود ہے۔ اس کے آخر میں گیارہ فارسی قطعے ہیں جن کا نام "اسمائے فارسی" رکھا گیا ہے۔ یہ میرزا غالبؔ کا نہیں بلکہ ملا جامیؔ کا کلام ہے[۱۵]۔

۹۔ انتخاب غالب

۴۸ؔ صفحے کی یہ مختصر کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے[۱۶]۔ پہلے حصے

میں دو دیباچے اور ۱۲ خط، دو نقلیں اور ایک لطیفہ ہے۔ دوسرے حصے میں دیوان اُردو میں سے ۱۳۱ شعر انتخاب کر کے درج کیے ہیں۔ شروع اور آخر میں غالبؔ ہی کی لکھی ہوئی دو مختصر نثریں ہیں [۱۷]۔

دونوں دیباچے اردوئے معلی میں موجود ہیں۔ پہلا میرزا رجب علی بیگ سرورؔ کی کتاب "گلزار سرور" کا ہے اور دوسرا خواجہ بدر الدین خاں (خواجہ امان) کی حدائق الانظار کا خط سب کے سب میر مہدی مجروح کے نام ہیں۔ ان میں صرف ایک خط نیا ہے [۱۸]۔ ایک نقل سے غدر کے زمانے میں غالبؔ کے حالات سے متعلق کچھ نئ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اس مختصر مجموعے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اسے خود غالبؔ نے مرتب کیا اور یہ عود ہندی اور اُردوئے معلی دونوں سے پہلے ۱۸۶۶ء میں شائع ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں (پروفیسر عربی، دلی کالج) انگریز افسروں اور فوجیوں کو اُردو پڑھنے کے لئے ایک انشا مرتب کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے میرزا سے مدد کے لیے کہا، تو میرزاؔ نے یہ خطوط وغیرہ جمع کر دیئے جانے مولوی صاحب موصوف نے ان سے کیا کہا لیکن میرزا کا گمان یہ تھا کہ یہ مجموعہ فنانشل کمشنر پنجاب میکلوڈ صاحب کے پیش ہونے والا ہے اس لئے وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب میکلوڈ صاحب کی نذر ہے اور اسے شائع کیا جائے۔ مولوی صاحب نے اس کے، خطوط اپنی مرتبہ انشائے اردو (حصہ دوم) میں شامل کر لیے تھے جو ۱۸۶۶ء میں مطبع فیض احمدی میں چھپی تھی۔

غالب نے جو نسخہ مولوی ضیاء الدین خاں کے لئے لکھوایا اور انہیں دیا تھا۔ یہ ان کے کتاب خانے سے دستیاب ہوا اور کسی طرح عارضی طور پر جناب محمد عبد الرزاق صاحب کے ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے اسے مرتب کر کے پہلی مرتبہ چشتیہ پریس، حیدرآباد میں چھپوا کر ۱۹۲۶ء (۱۳۴۵ھ) میں شائع کرا دیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن دین محمدی پریس لاہور میں ۱۹۴۳ء میں چھپا تھا۔ [۱۹]

---

۱ گلِ رعنا کا مکمل نسخہ میرے پاس ہے۔ اس سے متعلق میں دو منفصل مضمون لکھ چکا ہوں۔ اردو حصے والا مضمون ابھی تک شائع نہیں ہوا بغدر ذاکر میں شامل ہے۔ فارسی حصے سے متعلق دیکھئے نگارؔ (لکھنو) جولائی ۱۹۶۰ء

۲ گلِ رعنا کے اول و آخر کی فارسی نثر میں میرزا کے کلیاتِ نثر میں شامل ہیں۔ اس کے ایک مدت بعد میرزا نے اپنے کلام کا ایک اور انتخاب نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر ۱۸۶۶ء میں بھی کیا تھا۔ یہ ریاست رام پور کے کتاب خانے میں محفوظ رہ گیا۔ اسے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے "انتخاب غالب" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ (۱۹۴۲ء) کے لئے بھی دیباچہ انہوں نے احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کو کلکتے سے بھیجا تھا۔ (کلیاتِ نثر صفحہ ۱۱۰ نیز یادگارِ غالبؔ ۳۴۳-۳۴۴)

۳ میرزا نے جس مجموعے سے یہ انتخاب مرتب کیا تھا، غالباً وہ تو اب محفوظ نہیں۔ البتہ ہماری موجودہ معلومات کے مطابق دیوان اُردو کا سب سے قدیم قلمی نسخہ وہ ہے جس کی کتابت ۱۸۲۱ء میں ہوئی تھی اور تجو میاں فوجدار خاں بہادر (بھوپال) کے کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ یہ گمان غالبؔ اسے میرزا جی نے اپنے استعمال کے لیے لکھایا تھا۔ یہ نسخہ "حمیدیہ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ مولانا محمود خاں شیرانی مرحوم کا نسخہ (موجودہ کتاب خانہ پنجاب یونیورسٹی لاہور) اس کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اب یہ تمام مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مرتبہ دیوانِ غالبؔ (نسخہ عرشیؔ) میں بھی شائع ہو گیا (تنبیہہ۔ مولانا عبد الباری آسیؔ الدنی مرحوم نے بھی کچھ کلام میرزا کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ غالب کا نہیں)۔

۴ مکاتیب غالبؔ ص ۳۲،۳۱ (دیباچہ)

۵ اردوئے معلی ۲۸۲ خطوط غالبؔ (ا) ص ۴، ۳

۶ دیکھئے عبارت خاتمہ نسخہ مطبوعہ مطبع نظامی کانپور۔

۷ ادبی خطوط غالبؔ کے فاضل مولف مرزا محمد عسکری مرحوم کو اس تاریخ سے یہ شبہ ہوا کہ ''عود ہندی'' سب سے پہلے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی (صفحہ ۷) حالانکہ اور تمام قرائن کو چھوڑ کر نامۂ غالبؔ کی اس میں شمولیت ہی ان کے اس خیال کی تردید کے لئے کافی تھی کیونکہ یہ خط ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا تھا۔ انہیں اردوئے معلی سے متعلق بھی غلط فہمی ہوئی جو انہوں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب میرزا کی زندگی میں شائع ہوچکی تھی۔ (صفحہ ۹)

۸ اس ایڈیشن کی مفصل کیفیت کے لئے دیکھیں رسالہ ''ہندوستانی'' الہ آباد (اکتوبر ۱۹۳۵ء) مضمون '' عودِ ہندی کی ترتیب''۔ از مہیش پرشاد

۹ عود ہندی۔ صفحہ ۱۲۹

۱۰ اُردوئے معلی صفحہ ۲۹۴ بنام (نواب علائی) خطوط غالب (ا) ص ۳۴۹

۱۱ اُردوئے معلی صفحہ ۲۶۸ (بنام شیونرائن) نیز صفحہ ۶۷ (بنام تفتہؔ) خطوط غالبؔ (ا) صفحہ ۵۸۔۵۹ نیز صفحہ ۳۸۷۔

۱۲ اس مجموعے میں حقیرؔ کے نام ۴۲ خط ہیں۔ ایک خط (نمبر ۴۷) دراصل منشی شیونرائن کے نام کا ہے اور غلطی سے عبد اللطیف کے نام سے چھپ گیا ہے۔ یہ غلطی روز اول سے چلی آرہی۔ اُردوئے معلی (صفحہ ۲۰۵) میں بھی یہ حقیرؔ ہی کے نام سے چھپا ہے۔

۱۳ ۱۹۳۹ء میں ایک مختصر مجموعہ ''نادر خطوطِ غالبؔ کے نام سے سید محمد اسماعیل رساؔ ہمدانی مرحوم نے شائع کیا تھا لیکن جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں۔ مرتب نے مطبوعہ خطوں کے ٹکڑے ادھر ادھر سے جمع کر کے یہ خط تیار کر لیے ہیں۔ ورنہ میرزا نے کبھی یہ ان کے پرداداجناب کرامت ہمدانیؔ مرحوم کے نام نہیں لکھے تھے (دیکھئے میرا مضمون نادرِ خطوطِ غالبؔ مرتبہ رساؔ ہمدانیؔ پر ایک نظر۔ جامعہ دہلی مارچ ۱۹۴۲ء) نیز نادر خطوط غالبؔ (تبصرہ) از قاضی عبدالودود، معیار، پٹنہ (جنوری ۱۹۴۳ء)۔

۱۴ اردو (۱۹۳۶ء) صفحہ ۴۰۵ (مضمون ''میرن صاحب'' از مولانا عبدالحق) مولانا غلام رسول مہرؔ کو اس رسالے کے غالب کی تصنیف ہونے میں کلام ہے (غالبؔ صفحہ ۳۸۳) میں اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی بنیاد پر ثابت کر چکا ہوں کہ یہ غالبؔ ہی کا لکھا ہوا ہے (دیکھئے میرا مضمون ''قادر نامہ کا مصنف'' مطبوعہ اردو۔ جولائی ۱۹۴۷ء)۔

۱۵ مکاتیب غالبؔ صفحہ ۳۶ (دیباچہ)

۱۶ اس کا اصلی قلمی نسخہ جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب (الہ آباد) کے پاس ہے۔ اسی کا ذکر ''رقعاتِ غالب'' کے نام سے خطوط غالب (ا) کے دیباچہ میں آیا ہے (ص، ک)۔

۱۷ یہ دونوں نثریں علی گڑھ میگزین (غالب نمبر میں چھپ چکی ہیں (ص ۹۸۔۱۰۱)

۱۸ اب یہ خطوط غالب میں شامل ہے۔ خط نمبر ۳۲۷ (صفحہ ۲۸۴)

۱۹ کتابی صورت میں چھپنے سے پہلے یہ مجموعہ حیدر آباد دکن کے ماہانہ رسالے ''تحفہ'' میں بھی بالاقساط چھپا تھا (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء)

تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن یو۔ایس۔اے
تعلیمی وظائف کا اجراء

الحمدللہ، امسال نظارت تعلیم کی زیر نگرانی تعلیم الاسلام کالج المنائی یو۔ایس۔اے سکالر شپس کی باقائدہ اجراء عمل میں آیا۔ سال ۲۰۱۳ء میں انجمن طلبائے قدیم امریکہ کی خواہش اور نظارت تعلیم، صدر انجمن احمدیہ کی سفارش پر حضرت خلیفۃ المسیح نے دس سال تک کے لیے ۱۵ ہزار ڈالر مالیت کے چھ سکالر شپس کے اجرا کی تحریک کو ازراہ شفقت منظور فرمایا تھا۔ گذشتہ سال اپنے سالانہ اجلاس میں انجمن طلبائے قدیم یو۔یس۔اے نے اس سکالر شپ کی توثیق کرنے کے ساتھ محترم صدر مجلس کو سکالر شپ کے جملہ انتظامی امور کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی کے قیام کا اختیار دیا تھا۔ محترم صدر صاحب نے اس اختیار کے تحت مکرم ڈاکٹر صفی اللہ چوہدری کی زیر نگرانی درج ذیل ممبران پر مشتمل سکالر شپ کمیٹی کی تشکیل دی:

۱۔ڈاکٹر صفی اللہ چوہدری (چیئرمین) ۲۔ناصر احمد جمیل (سیکرٹری) ۳۔ سفیر رامہ ۴۔ منور احمد نعیم ۴۔ڈاکٹر عبدالخالق ۵۔ محمد داؤد منیر۔

کمیٹی نے اپنے قیام کے بعد فوری طور پر ۲۰۱۵ء کے سکالر شپ کے لیے ۱۵ ہزار ڈالر کی خطیر رقم جنوری ۲۰۱۵ء تک اکٹھا کر کے نظارت تعلیم کو بھجوانے کے لیے حکمت عملی ترتیب دی اور اللہ تعالی کے فضل سے مارچ ۲۰۱۵ء میں یہ رقم جمع کر کے نظارت تعلیم کو بھجوانے میں کامیاب رہی۔ کمیٹی کے ہر ممبر نے فرداً فرداً المنائی کے جملہ ممبران سے رابطہ کیا اور اس بابرکت سکیم میں شامل ہونے کے درخواست کی۔

جماعت احمدیہ امریکہ سے درج ذیل حضرات نے اس سکیم کے لیے دل کھول کر نقد عطیہ جات فراہم کیے:

ڈاکٹر فیضان عبداللہ، ڈاکٹر لئیق احمد، محمود احمد، نسیم احمد، سردار رفیق احمد، سید محمد احمد، سید ساجد احمد، ڈاکٹر انیس احمد، مرزا ارشاد بیگ، انیس عقیل احمد، خالد مقصود باجوہ، ڈاکٹر امتیاز احمد چوہدری، ڈاکٹر صفی اللہ چوہدری، منور احمد نعیم، مظفر احمد چوہدری، پرویز اسلم چوہدری، شوکت پرویز واہلہ، عبدالرشید فوزی، ڈاکٹر ریاض الحق، ڈاکٹر محمد ادریس، ناصر جمیل، ڈاکٹر عبدالخالق، عبدالمنان خان، ڈاکٹر آغا شاہد خان، کلیم اللہ خان، ڈاکٹر محمد شریف خان، ناصر کامران لطیف، ملک منصور احمد، ملک مظفر احمد، عنایت اللہ منگلا، محمد ادریس منیر، ڈاکٹر مہدی علی قمر، ڈاکٹر فہیم یونس قریشی، راجہ ناصر احمد، امتیاز احمد راجیکی، سفیر رامہ، منور احمد ثاقب، سیّد وسیم احمد، مبشر شاہ، بشیر الدین شمس، مبشر سولنگی، مبارک تنویر، ڈاکٹر حمید الرحمان، ڈاکٹر نعیم لغمانی اور طاہر تسنیم احمد۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان تمام احباب کی خلوص دل سے کی گئی قربانی کو قبول فرمائے اور ان کے اموال میں برکت ڈالے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ ان قربانیوں سے مستفید ہونے والے احمدی طلبا اور طالبات کو علمی اور عملی زندگی میں کامیابیوں سے ہمکنار کرتا چلا جائے۔ آمین۔

ہمیں اُمید ہے کہ تمام ممبران المنائی اور اُن کے دوست احباب آئندہ سالوں میں بھی مالی تعاون جاری رکھیں گے۔ انشاءاللہ

روزنامہ الفضل .... 7 .... 25 فروری 2015ء

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن USA سکالرشپس

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی منظوری سے تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن یو ایس اے چیپٹر ذہین اور ضرورت مند طلبہ وطالبات کیلئے نظارت تعلیم کے تحت درج ذیل سکالرشپس شروع کر رہی ہے۔ جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن یو ایس اے سکالرشپ IV

(TICA-USA Scholarship IV)

i۔ یہ سکالرشپ ایسے طلباء وطالبات کو بطور انعام دی جائے گی جنہوں نے پاکستان کی کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے بی ایس (چار سالہ) پروگرام میں کسی بھی مضمون میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو۔

ii۔ بی ایس چار سالہ پروگرام میں اول، دوم سوم آنے والے طالب علم یا طالبہ کو یہ سکالرشپ بطور انعام دی جائے گی۔

a۔ اول پوزیشن پر آنے والے طالب علم/طالبہ کو مبلغ ساٹھ ہزار روپے (Rs.60,000)

b۔ دوم پوزیشن پر آنے طالب علم/ طالبہ کو مبلغ پچاس ہزار روپے (Rs.50,000)

c۔ سوم پوزیشن آنے والے طالب علم/ طالبہ کو مبلغ چالیس ہزار روپے (Rs. 40,000)

iii۔ انعامات کا فیصلہ موصولہ درخواستوں میں سب سے زیادہ فیصد نمبر حاصل کرنے پر میرٹ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

iv۔ ایک جیسے فیصد نمبر حاصل کرنے پر اس پوزیشن پر آنے والے طلبہ/ طالبات میں انعام تقسیم کر دیا جائے گا۔

v۔ کسی اور سکالرشپ میں نام آنے کی صورت میں طالب علم یا طالبہ کو یہ سکالرشپ نہ دی جائے گی۔

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن یو ایس اے سکالرشپ V

(TICA-USA Scholarship V)

i۔ یہ سکالرشپ ایسے طلبا وطالبات کو دی جائے گی جنہوں نے پاکستان کی کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے ایم فل یا ایم ایس پروگرام میں کسی بھی مضمون میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو۔

ii۔ ایم فل یا ایم ایس پروگرام میں 80% سے زائد نمبر حاصل کرنے پر پہلی دو پوزیشنوں میں یہ سکالرشپ بطور انعام دی جائیگی۔

a۔ پہلی پوزیشن پر آنے والے طالب علم/ طالبہ کو مبلغ اسی ہزار روپے (Rs.80,000)

b۔ دوسری پوزیشن پر آنے طالب علم/ طالبہ کو مبلغ ستر ہزار روپے (Rs. 70,000)

iii۔ اگر کوئی درخواست 80% سے زائد نمبر پر موصول نہ ہوئی تو 70% سے زائد نمبر حاصل کرنے والی پہلی دو پوزیشنوں کو یہ سکالرشپ بطور انعام دی جائے گی۔

iv۔ کسی اور سکالرشپ میں نام آنے کی صورت میں طالب علم یا طالبہ کو یہ سکالرشپ نہ دی جائے گی۔

v۔ انعامات کا فیصلہ موصولہ درخواستوں میں سب سے زیادہ فیصد نمبر حاصل کرنے پر میرٹ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

vi۔ ایک جیسے فیصد نمبر حاصل کرنے پر اس پوزیشن پر آنے والے طلبہ/ طالبات میں انعام تقسیم کر دیا جائے گا۔

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن یو ایس اے سکالرشپ VI

(TICA-USA Scholarship VI)

i۔ اسی طرح کسی بھی سرکاری یا ہائر ایجوکیشن سے منظور شدہ میڈیکل یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کی تعلیم مکمل کرنے پر یہ سکالرشپ بطور انعام دی جائے گی۔

ii۔ کسی بھی سرکاری یا ہائر ایجوکیشن سے منظور شدہ انجینئرنگ یونیورسٹی سے کسی بھی مضمون میں بیچلرز انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے پر یہ سکالرشپ بطور انعام دی جائے گی۔

iii۔ ایم بی بی ایس کی تعلیم مکمل کرنے پر مبلغ پچھتر ہزار (Rs.75,000) بطور انعام دیئے جائیں گے۔

iv۔ بیچلرز انجینئرنگ (کسی بھی مضمون میں بھی) کی تعلیم مکمل کرنے پر مبلغ پچھتر ہزار (Rs.75,000) بطور انعام دیئے جائیں گے۔

v۔ انعامات کا فیصلہ موصولہ درخواستوں میں سب سے زیادہ فیصد نمبر حاصل کرنے پر میرٹ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

vi۔ ایک جیسے فیصد نمبر حاصل کرنے پر اس پوزیشن پر آنے والے طلبہ/ طالبات میں انعام تقسیم کر دیا جائے گا۔

قواعد وضوابط

1۔ یہ اعلان 2014ء میں ہونے والے سالانہ امتحانات کے لئے ہے اس سے پہلے کا کوئی کیس اس سکیم میں شامل نہ ہوگا۔

2۔ اس سکیم کا اطلاق صرف اور صرف پہلے سالانہ امتحان (First Annual Examination) پر ہوگا۔

3۔ مرحلہ وار (By Parts) یا نمبر بہتر کرنے یا (Division Improve) کرنے والے طلباء وطالبات اس مقابلہ میں شامل ہونے کے اہل نہ ہوں گے۔

4۔ بعض مخصوص سکالرشپس کے علاوہ طلباء وطالبات کیلئے الگ الگ معیار نہیں ہیں بلکہ موصولہ درخواستوں میں اپنے شعبہ میں جو بھی سب سے زیادہ نمبر حاصل کرے گا وہ انعام کا حقدار قرار پائے گا۔

درخواست دینے کا طریقہ کار

درخواست جمع کروانے کی آخری تاریخ 10 مارچ 2015ء ہے۔

درخواست فارم پر اپنے کوائف مہیا کریں۔ درخواست فارم کے بغیر درخواست قابل قبول نہ ہو گی۔

سادہ کاغذ پر درخواست بنام ناظر تعلیم صدر انجمن احمدیہ ربوہ بھی بھجوائیں۔

درخواست کے ساتھ متعلقہ ڈگری کے رزلٹ کارڈ Transcript کی نقل لف کرنا لازمی ہوگا۔

درخواست فارم پر مکرم امیر صاحب ضلع/مکرم صدر صاحب حلقہ کی تصدیق لازمی ہوگی۔ تصدیق کے بغیر کوئی درخواست زیر غور نہ لائی جائے گی۔

انعام کے حقدار طلباء کو ان کی درخواست پر درج پتہ یا فون نمبر پر اطلاع دی جائے گی۔ لہٰذا مکمل پتہ اور فون نمبر اور ای میل ایڈریس لازمی تحریر کریں۔ عدم دستیابی مکمل پتہ وفون نمبر کی وجہ سے اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے دفتر پر کوئی حرف نہ ہوگا۔ نیز اسناد کی تمام نقول A-4 پیپر پر اور واضح ہوں۔ مزید معلومات اور فارم نظارت تعلیم کی ویب سائٹ www.nazarattaleem.org سے یا ای میل کے ذریعے بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

نظارت تعلیم صدر انجمن احمدیہ ربوہ

Email:info@nazarattaleem.org

فون: 047-6212473 فیکس: 047-6212398

(نظارت تعلیم)

☆☆............☆............☆☆

علم کا فروغ اور اس کی روشنی دُنیا میں پھیلانا دین حق کا بنیادی مشن ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو خدائے عزو جل نے پہلی وحی میں فرمایا اقراء۔۔ کہ پڑھ اللہ کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا۔ آپ ﷺ نے فروغ علم کے لئے بے پناہ جد وجدہ کی۔ آپ ﷺ نے تحصیل علم کو جہاد قرار دیا یہاں تک فرمایا کہ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ پھر فرمایا کہ پنگھوڑے سے قبر تک علم حاصل کرو۔

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے خبر پا کر ہمیں یہ نوید دی کہ

میرے فرقہ کے لوگ علم اور معرفت میں ۔۔۔ کمال حاصل کریں گے۔ (تجلیات الٰہیہ۔ روحانی خزائن جلد 20۔ صفحہ 409)

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ نے فرمایا:

اگر ہم اپنی غفلت کے نتیجہ میں اچھے دماغوں کو ضائع کر دیں تو اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں ہو گا۔ پس جو طلبہ ہونہار اور ذہین ہیں ان کو بچپن سے ہی اپنی نگرانی میں لے لینا چاہیے اور انہیں کامیاب انجام تک تک پہنچانا جماعت کا فرض ہے

(خطبات ناصر جلد اول صفحہ 85)

جناب داود طاہر کی کتاب سے ایک باب

یاد آئی جب اُن کی گھٹا کی طرح ۔۔ ذکر اُن کا چلا نسیم ہوا کی طرح

داؤد طاہر

مجھے اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران بے شمار طلبہ کی معیت حاصل رہی۔ ان میں سے کچھ کا سلسلہ تعلیم بوجوہ منقطع ہو گیا، بعض ہم جماعتوں نے سکول یا کالج کی تعلیم کے دوران ربوہ کی سکونت ترک کر دی اور کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو جانے والے ہمارے ساتھیوں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ ابھی ہم پانچویں جماعت میں تھے کہ ہمارے ایک کلاس فیلو منور احمد جو یوسف بریلوی کے صاحبزادے تھے کچھ دن بیمار رہ کر وفات پا گئے۔ وہ ربوہ ہی میں دفن ہوئے۔ ان کی قبر پر سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا کتبہ لگا ہوتا تھا۔ وہ چونکہ میرے دوستوں میں سے تھے لہٰذا میرا جب قبرستان سے گذر ہوتا میں ان کی قبر پر رُک کر ان کی بلندی درجات کے لیے دعا ضرور کرتا۔ خواجہ عبد السّلام المعروف چھاماجو ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ وہ ٹاؤن کمیٹی ربوہ کے پاس ایک چائے خانہ چلاتے تھے۔ میرا ادھر سے گذر ہوتا اور ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو ضرور آگے بڑھ کر سلام کرتے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ میں ان سے چائے پیے بغیر نہ جاؤں اور کبھی کبھی وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ مدت تک نظر نہ آئے۔ تب کسی نے بتایا کہ وہ مختصر علالت کے بعد وفات پا چکے ہیں۔

محمد حسین موذّن کے بڑے بیٹے احمد حسین سکول میں ہمارے ساتھ تھے۔ صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت میں تھے کہ وفات پا کر ربوہ میں دفن ہوئے۔

ہمارے بہت سے مرحوم ہم جماعتوں میں سے ایک راجہ عبد الخالق تھے جو میجر عبد الحمید سابق مجاہد انگلستان، امریکہ و جاپان کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ان کی والدہ سکینہ بیگم جنھیں ہم اپنے گھر میں ”آپا سکینہ“ کہتے تھے یکے از ۳۱۳ رفقائے حضرت مسیح موعود، حضرت میاں محمد دین، واصل باقی نویس کی نواسی اور صوبیدار مظفر خان کی صاحبزادی تھیں۔ چونکہ حضرت میاں محمد دین نے امی کے دادا، حضرت مرزا جلال الدین کے ذریعے احمدیت قبول کی تھی لہٰذا ان کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم تھے جو بعد میں ان کی اولادوں میں بھی منتقل ہوئے۔ اسی ناطے وہ مجھ سے بھی ہمیشہ محبت کا سلوک فرماتیں۔ انہوں نے ہمارے خاندان کی ہر خوشی اور غمی میں شمولیت فرمائی بلکہ میری شادی کے موقع پر اپنی صحت کی کمزوری کے باوجود ربوہ سے راولپنڈی تشریف لائیں۔ صرف یہی نہیں انہوں نے مجھے موقع کے مطابق اپنی دعاؤں کے علاوہ قیمتی تحائف سے بھی نوازا۔ مجھے یاد ہے ۱۹۵۹ء میں جب آپا کی شادی

ہونے والی تھی آپا سکینہ کوئٹہ میں مقیم تھیں۔ شنید تھی کہ کوئٹہ میں اعلیٰ معیار کا سمگل شدہ کپڑا پنجاب کی نسبت سستے داموں مل جاتا ہے چنانچہ امی نے ان سے رابطہ کیا اور انہوں نے اس حوالے سے ہماری ہر ممکن معاونت کی۔

خالق نے اپنی تعلیم کا آغاز کوئٹہ سے کیا تھا البتہ انہوں نے میٹرک میرے ساتھ تعلیم الاسلام ہائی سکول سے پاس کیا۔ کالج میں ہمارے مضامین ایک جیسے نہ رہے لیکن ہم نے گریجوایشن ایک ہی سال میں کی۔

اس عرصے میں میجر عبدالحمید ریٹائر ہونے کے بعد اپنی زندگی وقف کر چکے تھے اور ان کی تعیناتی امریکہ میں تھی چنانچہ خالق بھی مستقل طور پر وہیں چلے گئے۔

۱۹۷۱ء کے آخری دنوں کی بات ہے۔ ایک بار میں اپنے کسی کام کے سلسلہ میں راولپنڈی ریلوے سٹیشن کے پاس گھوم رہا تھا کہ اچانک خالق نظر آ گئے۔ معلوم ہوا کہ امریکی شہری ہونے کے ناطے انہیں لازمی فوجی سروس کے قواعد کے تحت دو سال کے لیے بطور میٹرولوجیکل آبزرور ویت نام بھجوایا گیا تھا جہاں سے وہ چھٹی پر پاکستان آئے ہوئے ہیں لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باعث پروازوں میں تعطّل کی وجہ سے وقت پر ویت نام واپس نہیں پہنچ پائے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اگرچہ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب وہ ویت نام واپس پہنچے تو ڈیوٹی سے غیر حاضری کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے تاہم بالآخر رہا ہوئے اور لازمی فوجی سروس کا عرصہ پورا کرنے کے بعد امریکہ واپس گئے۔

"اس واقعہ کی تفصیلات کیا تھیں؟" ایک بار میں نے ان کے بڑے بھائی سکواڈرن لیڈر (ر) عبدالمالک جو کرنل مرزا داؤد احمد کے داماد اور میجر جنرل (ر) مسعود الحسن نوری کے ہم زلف ہیں سے پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے" انہوں نے مجھے بتایا "قواعد و ضوابط کے مطابق ایک معیّنہ مدت کی اَیکٹِوڈیوٹی کے بعد خالق ایک ہفتے کی رخصت برائے آرام و تفریح کے حقدار تھے جسے صرف بنکاک میں گذارا جاسکتا تھا۔ خالق کی خواہش تھی کہ وہ یہی وقت پاکستان میں اپنے خاندان کے ساتھ گذاریں تاہم متعلقہ حکام نے ان کی یہ درخواست رد کر دی۔ خالق جو پاکستان سے امریکہ جانے کے بعد سَین ہوزے میں مقیم رہے تھے نے وہاں کے اخبار "سین ہوزے مرکری" کے کالم "ایکشن لائن" میں اپنی کہانی شائع کرا دی۔ اس حلقے کے کانگریس مَین نے اس احتجاج کا فوری نوٹس لیا اور خالق کی دادرسی کے لیے متعلقہ حکام کو لکھا جس کے نتیجے میں خالق کے کمانڈنگ آفیسر، کرنل ہاف مین نے انہیں اپنے خرچ پر پاکستان جانے کی اجازت دے دی۔

وہ یہاں پہنچے ہی تھے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور پروازیں بند ہو گئیں۔ چونکہ خالق کی واپسی کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور وہ وقت پر واپس سائیگان نہ پہنچ سکتے تھے لہٰذا انہوں نے اسلام آباد سے امریکی سفارت خانے کے ذریعہ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو اپنی اس مجبوری سے مطلع کرتے ہوئے چھٹی بڑھانے کی درخواست کر دی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب حالات معمول پر آنے لگے اور پاکستان سے پروازیں شروع ہو گئیں، خالق ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو کراچی سے بنکاک کے راستے سائیگان کے لیے روانہ ہوئے تاہم انہیں بنکاک

میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ امیگریشن آفیسر کا کہنا یہ تھا کہ وہ گرین کارڈ ہولڈر ہونے کے باوجود تھائی ویزا کے بغیر بنکاک میں داخل نہیں ہو سکتے۔ معاملہ بڑھا تو امریکی فوج کے پرووسٹ مارشل کو طلب کیا گیا جس کی ہدایت پر ملٹری پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ان پر ڈیوٹی سے غیر حاضری کا الزام لگا۔ خالق نے بہتیری دہائی دی لیکن کسی نے ان کی ایک نہ سنی اور انہیں ہتھکڑی لگا کر سائیگان بھجوا دیا گیا۔ تحقیقات کے بعد انہیں اس الزام سے بری کر کے ڈیوٹی پر بحال کر دیا گیا چنانچہ وہ اپنی لازمی فوجی خدمت کے دو سال پورے کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں امریکہ واپس گئے۔"

چند سال پہلے آپا سکینہ کی زبانی یہ خبر سن کر دل کو دھچکا سا لگا کہ موصوف اچانک وفات پا گئے ہیں۔

"دراصل ویت نام میں قیام کے دوران انتقالِ خون میں عدمِ احتیاط کے باعث انہیں ہیپاٹائٹس سی ہو گیا تھا۔ مرض اندر ہی اندر رہا اور ایک بار اتفاقاً اس کی تشخیص ہوئی۔ اس تکلیف نے ان کے جگر کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کا جگر ٹرانسپلانٹ کا پروگرام بن چکا تھا لیکن اسی انتظار میں ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور وہ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۳ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے" آپا سکینہ نے ہی مجھے بتایا۔

وہ ۱۹۶۶ء میں امریکہ گئے تھے اور سین ہوزے سے بزنس ایڈمنسٹریشن (اکاؤنٹنگ) میں بی ایس کیا۔ بعد میں وہ واشنگٹن ڈی سی منتقل ہو گئے اور بزنس اینڈ پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کیا اور بالآخر سرٹیفائیڈ پبلک اکاؤنٹنٹ بن گئے۔ انہوں نے ساری زندگی سرکاری ملازمت کی تاہم انہیں جماعتی خدمات کی بھی توفیق ملی اور وہ نیشنل فنانس سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے۔

"ان کے بچے، بچیاں؟" میں نے آپا سکینہ سے پوچھا۔

"سب سے بڑی تو بیٹی ہے، ثمینہ۔ اب ڈاکٹر بن چکی ہے اور نیو جرسی میں کام کر رہی ہے۔ سائیکیاٹرِسٹ ہے۔ چھوٹا بیٹا عمر ہے اور کانو والے ڈاکٹر ضیاء الدین کی پوتی سے بیاہا ہوا ہے۔ بہت اچھا بچہ ہے، دبنگ، باپ دادا کی طرح بہادر اور دلیر۔ نادر اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ وکیل ہے، اچھا اور نیک نام۔"

"خالق کی شادی تو صبیحہ سے ہوئی تھی نا؟"

"اچھا! آپ کو یاد ہے۔ جی دھوریا والے کیپٹن عبد الرحمن کی بیٹی سے۔ آپ کی تو کیپٹن صاحب سے ملاقات تھی!"

خالق کے ذکرِ خیر کے بعد اب کچھ باتیں عبد الحمید کی جو ماسٹر اللہ بخش زراعتی کے صاحبزادے اور سکول میں ہمارے کلاس فیلو تھے لیکن کسی وجہ سے میٹرک ہمارے ساتھ نہ کر پائے۔ ہاں! غالباً ایک سال بعد وہ کالج پہنچ گئے۔

وہ فٹ بال کے اچھے کھلاڑیوں میں سے تھے اور کالج ٹیم میں شامل تھے۔

ان کی کسی اور غیر نصابی سرگرمی کا تو مجھے علم نہیں البتہ وہ کالج کی عربی سوسائٹی (جسے جمعیۃ طلاّب العربیہ کہا جاتا تھا) کے ۶۵۔ ۱۹۶۴ء کے دوران نائب الامین یعنی اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ اس سال میں اس سوسائٹی کا نائب الرئیس منتخب ہوا تھا۔

وہ شروع میں صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر میں کام کرتے تھے مگر بعد میں پاکستان ایئر فورس میں ٹیکنیشن بھرتی ہو گئے۔ وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک کے دوران ڈھاکہ میں تعینات تھے تاہم سقوطِ ڈھاکہ سے ایک دو روز پہلے کسی طرح وہاں سے فرار ہو کر بالآخر پاکستان آنے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایئر فورس سے استعفیٰ دے دیا اور کنسٹرکشن بزنس سے منسلک ہو

گئے۔ لمبا عرصہ کراچی میں رہے لیکن اپنی علالت کی وجہ سے ۲۰۰۸ء کے شروع میں لاہور منتقل ہو گئے۔

ان کے بھائی مجید طاہر نے ایک بار ان کا فون نمبر دیا تو طبیعت ان سے بات کرنے کو مچل اُٹھی لیکن یہ جان کر افسوس ہوا کہ وہ سانس کی کسی بیماری کی وجہ سے شیخ زید ہسپتال میں داخل ہیں۔ میں ان کے پاس پہنچا تو پہچان نہ پایا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے تھے۔ میں نے آخری بار انہیں پچاس سال پہلے دیکھا تھا جب وہ ایئر فورس میں بھرتی ہوئے تھے۔ اس وقت جوانی کا عالم تھا لیکن آج وہ جسمانی کمزوری کی وجہ سے چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو چکے تھے اور ان کا سانس بار بار اکھڑ رہا تھا۔ میں نے کہا: ”آپ تھک گئے ہوں تو کچھ دیر آرام کر لیں، باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں“ لیکن وہ غالباً میری دلجوئی کے لیے میری بات ماننے کو تیار نہ تھے۔

انہیں دل کا حملہ ہو چکا تھا اور ان کی مرض کی نوعیت خاصی پیچیدہ تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق اب ان کا بائی پاس ہو سکتا تھا نہ انجیئوپلاسٹی ممکن تھی۔ کچھ ڈاکٹروں کا یہ بھی خیال تھا کہ انہیں ٹی بی ہے لیکن ٹیسٹوں سے بیماری کی تشخیص میں کوئی مدد نہ مل سکی حالانکہ وزن تھا کہ مسلسل کم ہوتا جا رہا تھا۔

حمید نے انکشاف کیا کہ ان کی ایک بیٹی کینیڈا میں ہوتی ہے اور دوسری انگلینڈ میں جب کہ ان کا اکلوتا بیٹا جرمنی میں ہے۔

”اس کا مطلب ہے آپ اور بھابھی یہاں اکیلے رہ رہے ہیں“ میں نے کہا۔

”نہیں میری بہو ابھی یہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ رہتی ہے“ ادھر سے قدرے اطمینان بخش جواب آیا۔

ان کے پاس ان کا ایک خالہ زاد بھائی بیٹھا ہوا تھا جو بھاگ کر میرے لیے ایک کپ چائے لے آیا۔ وہ بسکٹوں کا ایک پیکٹ بھی لے کر آیا تھا لیکن سچ پوچھیں تو میرا جی چائے پینے کو چاہ رہا تھا نہ بسکٹ کھانے کو۔ صرف ان کا دل رکھنے کی خاطر میں نے چائے کا کپ زہر مار کیا۔

میں ان کے ساتھ مزید ملاقاتوں کے وعدہ پر رخصت ہوا لیکن یہ نوبت ہی نہ آ پائی۔ ایک دن مجید طاہر کے اچانک فون سے پتا چلا وہ لاہور میں ہیں اور اپنے بڑے بھائی، عبدالرشید کے ہاں ڈیفنس میں مقیم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ حمید وفات پا گئے ہیں اور وہ اسی سلسلے میں پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اگلی صبح جرمنی واپس چلے جانا تھا لہٰذا میں فوراً ان سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔ ”بس ان کی بیماری ہی کچھ ایسی پیچیدہ تھی کہ آخر تک صحیح تشخیص نہ ہو پائی“ انہوں نے بتایا۔

وہ شخص جو کسی زمانے میں فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا اور جس کی صحت پر دوسرے رشک سے نگاہ کیا کرتے تھے مُشتِ استخوان بن کر منوں مٹی تلے دفن ہو چکا تھا۔

”ان کی تدفین ہانڈُو گُجر میں ہوئی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”نہیں۔ وہ موصی تو نہ تھے لیکن ربوہ کے پرانے باسی تھے لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ وہ وہیں دفن ہوں۔ بھائی جان رشید نے ان کی اس خواہش کے مدِ نظر ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ سے اس امرِ کی خصوصی اجازت حاصل کر رکھی تھی چنانچہ اللہ کے فضل سے وہ ربوہ میں دفن ہوئے۔“

عبدالحمید کے بعد اب کچھ ذکر ہمارے اس دوست کا جو وطن فروشوں کی ایک سازش کا شکار ہو کر اپنے گھر سے بہت دور اپنے وطن کے ساتھ محبت کے جرم میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ میرا

اشارہ عبد السمیع پرویز کی طرف ہے جو سکول کے زمانہ سے میرے کلاس فیلو تھے اور ہم کالج میں بھی دو سال اکٹھے رہے لیکن اس کے بعد وہ پڑھائی نہ جاری رکھ سکے اور مشرقی پاکستان چلے گئے۔

سمیع چوہدری محمد شریف، سابق مربی بلادِ عربیہ کے بھائی، چوہدری عبد الرحیم کے صاحبزادے، مولانا غلام باری سیف کے برادرِ نسبتی اور ڈاکٹر عبد الخالق، نائب صدر مجلس انصار اللہ مرکزیہ کے ماموں تھے لیکن چونکہ اب قصہ ماضی بن چکے ہیں اس لیے کسی کے پاس حتیٰ کہ ڈاکٹر عبد الخالق کے پاس بھی ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں تاہم خوش قسمتی سے میرے پاس ان کے تین خطوط محفوظ ہیں جو علی الترتیب ۱۴ ستمبر ۱۹۶۴ء، دو اکتوبر ۱۹۶۴ء اور اٹھارہ نومبر ۱۹۶۴ء کے لکھے ہوئے ہیں۔

ان خطوط کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپریل ۱۹۶۴ء میں مشرقی پاکستان گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر محمد شفیق سہگل حال نائب وکیل التصنیف، تحریک جدید انجمن احمدیہ کے کارخانہ، بنگال بیلٹنگ کارپوریشن، چٹاگانگ جو بجلی کے تار، ہوز پائپ، مشینوں کے پٹے، جوتے اور بہت سی دیگر اشیاء بناتا تھا میں کیشئر کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں: ''تنخواہ بھی معقول پاتا ہوں، رہائش فری ہے، کھانے وغیرہ کا خرچ بھی کمپنی دیتی ہے۔ سال میں آنے جانے کا کرایہ، ایک مہینہ کی رخصت ملے گی۔''

اپنے ایک خط میں انہوں نے اباجی کی وفات پر تعزیت بھی کی اور پھر چٹاگانگ کے موسم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا: ''یہاں تو ابھی سردی کا موسم شروع نہیں ہوا۔ بنگالیوں کے مطابق سردی شروع ہے۔ کوٹ سویٹر پہن کر پھرتے ہیں لیکن ہمارے مطابق بالکل گرمی ہے۔ رات کو پنکھا چلا کر اور چادر اوڑھ کر سوتے ہیں۔'' وہاں کی تازہ خبروں سے مطلع کرتے ہوئے انہوں نے لکھا: ''اتوار کے روز چٹاگانگ کے باہر کسی نہ کسی جھیل پر چلے جاتے ہیں اور خوب وقت گذر جاتا ہے۔ چند روز ہوئے چوہدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب آئے تھے۔''

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کے بعد ہماری خط و کتابت یا کوئی ملاقات نہیں ہوئی اور کئی سال اسی طرح گذر گئے۔ ایک دن خبر ملی کہ سمیع کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ فوجی وردیوں میں ملبوس کچھ لوگ انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے جن کے متعلق بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ مکتی باہنی کے رضاکار تھے۔ ان کے ہاتھوں سمیع کا کیا حشر ہوا ہوگا اس بارے میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔

سمیع کے ساتھ مشرقی پاکستان جانے والوں میں دواخانہ طب جدید والے حکیم محمد صدیق کے بیٹے صادق احمد نعیم بھی شامل تھے۔ صادق جو مذکورہ بالا فیکٹری کے ٹائم آفس میں کام کرتے تھے اوائل سکول سے میرے کلاس فیلو تھے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں مشرقی پاکستان میں پیش آنے والی مشکلات سے محفوظ رکھنا تھا چنانچہ وہ سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے ایک بار ربوہ آئے تو ان کے برادرِ اکبر، ماسٹر طاہر احمد نسیم نے انہیں یہیں روک لیا اور مشورہ دیا کہ وہ پہلے اپنی پڑھائی مکمل کریں اور پھر ملازمت کے بارے میں سوچیں۔ صادق نے ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے یہیں رہ کر پہلے بی کام کیا اور پھر کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی۔

۱۹۹۳ء میں میرا تبادلہ ملتان ہوا تو صادق اس کارپوریشن میں غالباً ریجنل ہیڈ کے طور پر کام کر رہے تھے اور ان سے جمعہ یا دیگر جماعتی تقریبات میں ملاقات رہتی تھی۔ وہ بالکل صحتمند نظر آتے تھے تاہم اسی عرصے میں انہیں برین ٹیومر ہو گیا اور وہ اس عارضے

سے جانبر نہ ہو سکے۔ انہوں نے چھ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو وفات پائی اور ربوہ میں دفن ہوئے۔

صادق کے بعد اب کچھ ذکر بشارت احمد جمیل کا جنہوں نے نامساعد حالات میں اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر امریکہ پہنچ کر اپنوں اور غیروں سے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کا وجود نہ صرف ان کے خاندان کے لیے بلکہ جماعت کے لیے بھی باعثِ صد افتخار تھا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ بشارت جمیل کب ہماری کلاس میں داخل ہوئے لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ انہوں نے میٹرک کا امتحان میرے ساتھ ہی پاس کیا تھا اور ہم نے کالج میں داخلہ بھی ایک ساتھ لیا تھا۔ انہیں ریاضی کے ساتھ عشق تھا چنانچہ بی اے میں پہنچے تو انہوں نے اپنے اختیاری مضامین کے طور پر میتھ اے اور بی کورسز کا انتخاب کیا۔ ہم نے ۱۹۶۵ء میں اکٹھے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ہم دونوں کے ڈپارٹمنٹس جدا جدا لیکن قریب قریب تھے اس لیے ہماری ملاقات کم و بیش روزانہ ہو جاتی۔ ان دنوں ان کی رہائش لاہور کینٹ میں کسی جگہ پر تھی اور وہ بائیسکل پر نیو کیمپس آیا کرتے تھے۔ میں ایم اے پولیٹیکل سائنس کرنے کے بعد تلاشِ معاش میں اُلجھ گیا لیکن بشارت جمیل مزید پڑھائی کے لیے امریکہ چلے گئے۔

پردیس جا کر شروع میں پرانے سنگی ساتھی بہت یاد آتے ہیں۔ ان دنوں خط ہی رابطے کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ مجھے بھی ان کے خطوط بکثرت آتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بھی امریکہ آجاؤں لیکن میں ان کی اس تجویز پر اپنے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کرتا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید میری تنگ دامنی اس راہ میں رکاوٹ ہے لیکن میں اس بات کا کھلے بندوں اعتراف نہیں کرنا چاہتا۔ تب انہوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ مجھے نہ صرف پاکستان سے امریکہ آنے کا کرایہ بھجوا دیں گے بلکہ وہاں کی کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی میں داخلے کا انتظام بھی کر دیں گے، بس وہاں آنے کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ تب میں نے انہیں لکھا: ''تم جانتے ہو اباجی تین سال پہلے وفات پا گئے تھے، میری سب بہنیں اپنے اپنے گھروں والی ہیں اور میں ہی امی کا واحد سہارا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ امریکہ جا کر میرے حالات یکسر بدل سکتے ہیں لیکن کیا میری طرف سے بھجوائے گئے چند سوڈالر امی کا وہ احساسِ تنہائی ختم کر سکیں گے جس کا سبب پاکستان سے میری غیر موجودگی ہو گی؟'' اس کے بعد بشارت جمیل نے کبھی اپنی بات پر اصرار نہ کیا لیکن میرے ساتھ ان کا اخلاص ہمیشہ قائم رہا۔ وہ پاکستان آتے تو مجھے ضرور ملتے۔ میں نے دو مواقع پر ان سے کچھ رقم بطور اُدھار بھجوانے کی درخواست کی اور انہوں نے دونوں بار خندہ پیشانی کے ساتھ میری یہ فرمائش پوری کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے یہ رقم انہیں وعدے کے مطابق لوٹا دی لیکن فی زمانہ کتنے لوگ ہیں جو کسی کی ضرورت میں اس کے کام آتے ہیں؟

اُن کی شادی پائینئر الیکٹرک کمپنی ملتان کے چوہدری عبدالطیف کی بیٹی رضیہ سے ہوئی تھی۔ میں ان کی بارات کے ساتھ ملتان گیا تھا اور ان کے ولیمہ میں بھی شامل ہوا تھا جس کا انتظام محلہ دارالبرکات میں ان کے گھر کے بالکل سامنے ایک خالی پلاٹ میں کیا گیا تھا۔ اس موقع پر صاحبزادہ مرزا رفیع احمد نے دعا کرائی تھی اور پھر دعوت میں شامل معززین کے ہمراہ ایک تصویر بھی اتروائی۔ اس تصویر میں بشارت جمیل کے علاوہ تعلیم الاسلام کالج میں ان کے ریاضی کے تینوں اساتذہ یعنی پروفیسر محمد ابراہیم ناصر، چوہدری حمید اللہ اور عبدالرشید غنی اور راقم الحروف بھی شامل تھے۔

خدا نے انہیں چار بیٹوں سے نوازا تھا۔ عرفان، سلمان، عثمان اور فرحان۔ جب وہ عرفان کے نکاح کے لیے پاکستان آئے تو میں راولپنڈی میں تھا۔ انہوں نے لاہور سے فون کر کے مجھے اس میں شمولیت کی دعوت دی۔ ان کے سمدھی پاکستان ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹس سروس کے یحییٰ خضر میرے جاننے والوں میں سے تھے اور میں اس نکاح میں شامل بھی ہونا چاہتا تھا لیکن میں کسی وجہ سے اس موقع پر حاضر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد سلمان کی سڑک کے ایک حادثہ میں وفات نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ وہ اندر ہی اندر گھلتے رہے اور اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

ان کی اہلیہ بتاتی ہیں: ۷ انومبر ۲۰۰۶ء کو جمعہ کا دن تھا۔ ہم صبح کے وقت اکٹھے گھر سے نکلے۔ میں نے ایک سٹور پر بعض چیزیں واپس کرنا تھیں۔ وہاں مجھے کچھ دیر لگ گئی تو وہ کہنے لگے: جو کام کرنا ہے جلدی جلدی نمٹالو، ایسا نہ ہو میرا جمعہ ضائع ہو جائے۔ میں نے اپنے کام سمیٹ لیے تو انہوں نے مجھے گھر چھوڑا اور بتایا کہ انہیں نماز کے بعد کسی سے ملنے جانا ہے، پھر وہ اپنے زیر تعمیر مکان پر جائیں گے لہٰذا انہیں گھر واپس آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ سہ پہر کے قریب یہ سوچ کر وہ فارغ ہو چکے ہوں گے میں نے ان سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا فون بند ملا۔ تعجب تو ہوا لیکن دل میں کوئی ایسا وہم نہیں آیا۔ بس یہی سوچتی رہی کہ اب آجائیں گے، اب آجائیں گے! وہ شام تک واپس نہیں لوٹے تو مجھے فکر ہوا۔ اتنی دیر میں عرفان گھر آیا تو میں نے اسے بتایا۔ ہمیں ہزاروا ہموں نے گھیر لیا۔ عرفان نے پولیس کو فون کیا اور پھر خود ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جب وہ ہمارے زیر تعمیر مکان پر پہنچا تو وہ اپنی گاڑی میں بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ان کی روح کو قفسِ عنصری سے پرواز کئے ہوئے کئی گھنٹے گذر چکے تھے۔"

"میں انہیں بھلا کیسے بُھلا سکتی ہوں" مسز بشارت کی گفتگو جاری تھی "انہوں نے نامساعد حالات میں اپنی زندگی کا آغاز کیا لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ایک ایسے مقام پر جا پہنچے جو قسمت والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے لیے ایک شاندار گھر تعمیر کرنا شروع کیا جس میں گیارہ بیڈز اور نو غسل خانے تھے۔ نقشے کے مطابق اس چار منزلہ گھر میں لفٹ بھی لگنا تھی۔ ایک بار وہ اپنے ٹھیکیدار کو بتا رہے تھے: شاہجہان نے تو ممتاز محل کی وفات کے بعد اس کے لیے تاج محل تعمیر کیا تھا لیکن میں نے اپنی بیوی کی زندگی میں ہی اس کے لیے تاج محل کھڑا کر دیا ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتے تھے وہ۔ انہوں نے واقعی میرے لیے تاج محل بنا دیا تھا۔ وہ میرا اتنا خیال رکھتے تھے جیسے چھوٹے بچے کا رکھا جاتا ہے اور اپنی کامیابیوں میں میرے کردار کو ہمیشہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ مجھے ان سے اپنی آخری ملاقات کبھی نہیں بھولتی۔ نہ جانے وہ کس بات پر بار بار کہہ رہے تھے آئی ایم پراوڈ آف یُو۔ آئی ایم رِیئلّی پراوڈ آف یُو۔"

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے امریکی چیپٹر کی ویب سائٹ پر بشارت جمیل کے بھائی عبد الہادی ناصر کا ایک مضمون موجود ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ بشارت جمیل کے امریکہ کے نامور اور بااثر سیاستدانوں کے ساتھ ذاتی اور دوستانہ تعلقات تھے... خاص طور پر ممبرانِ کانگریس، دفتر خارجہ اور اقوامِ متحدہ کے حقوق انسانی کے شعبوں میں خصوصی تعلق تھا۔ وہ... احمدیت کے لیے بے پناہ جذبہ اور غیرت رکھتے۔ احمدیت کے مفاد کو ہر دم مقدّم رکھتے اور اس کے لیے حکومت کے اعلیٰ ترین عہدیداروں سے ملنے

اور احمدیت کے لیے ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کام کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے اور جب بھی اور جس جگہ بھی جماعت کو ضرورت پیش آتی اپنی خدمات پیش کر دیتے تھے۔

بشارت جمیل نے اپنی زندگی انسانیت کی مدد کے لیے پورے عزم اور خلوص کے ساتھ وقف کر رکھی تھی... جنرل ضیاء الحق نے اپنے دورِ اقتدار میں احمدیوں پر جو ظلم ڈھائے اُن کے خلاف اور احمدیت کے بارہ میں اُس کے مذموم ارادوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی خاطر ڈاکٹر بشارت جمیل نے اپنے تمام ذرائع اور تعلقات بروئے کار لاتے ہوئے جنرل ضیاء الحق کی حکومت پر امریکہ کی کانگریس اور حکومت کا دباؤ برقرار رکھا۔

پیٖٹر ڈبلیو گالبر تھ جو ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۳ء تک امریکی سینیٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سینئر ایڈوائزر رہے، ضیاء الحق کے تاریک ترین دور کے خلاف اپنی کاوشوں کو یاد کرتے ہوئے عرفان جمیل کے نام اپنے تعزیتی خط میں لکھتے ہیں: ''۱۹۸۰ء کے عشرہ میں آپ اُن احمدیوں کے مقدمات میرے پاس لے کر آئے جنہیں پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی آمرانہ حکومت نے موت کی سزا سنائی۔ آپ کی انتھک اور مسلسل کوششوں کی وجہ سے کمیٹی نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور اُن کی زندگیاں بچانے میں کامیاب ہوئی...''

بشارت جمیل نے احمدیوں کے لیے امریکہ میں مذہبی بنیاد پر پناہ کے لیے امریکی دفتر خارجہ کی منفی رائے کو مثبت رائے میں تبدیل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس بارے میں بنیادی کام اُنہوں نے انسانی حقوق کی مایہ ناز وکیل کیرَن پارکر کے ساتھ مل کر کیا اور امریکہ میں احمدیوں کے پناہ کے مقدمات کی کامیابی کے لیے راستہ ہموار کر دیا...

US Commission of Religious Freedom کے پالیسی انالسٹ اور بشارت جمیل کے قریبی دوست سٹیوٗ سنو اپنے دوست کی وفات پر اپنے خیالات کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں: ''میری خوش بختی ہے کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں جب کہ امریکی حکومت کے دفتر خارجہ میں شرقِ قریب اور جنوبی ایشیا کے انسانی حقوق کے معاملات میرے سپرد تھے، بشارت جمیل میرے لیے جماعت احمدیہ کے بارہ میں معلومات مہیا کرنے کا نہایت قابل اعتماد ذریعہ رہے۔ آپ پاکستان کی صورت حال اور خصوصاً احمدیوں کے حالات کے متعلق قیمتی، بروقت اور درست معلومات... فراہم کرنے کا ایک بہت قیمتی ذریعہ تھے۔ انسانی اور مذہبی حقوق کے ساتھ آپ کی والہانہ وابستگی کی مثال آپ کے خاندان اور جماعت کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔''

بشارت جمیل یُو ایس ڈپارٹمنٹ آف ڈیفنس میں ریاضی دان کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی تھے۔ ان کا چلے جانا ان کے خاندان اور دوستوں کے علاوہ ایک جماعتی نقصان بھی ہے۔ سچ ہی تو کہا تھا انہوں نے:

تجھے اے بشارتِ بے نوا
تیرے رب نے کیسا یہ دل دیا
جسے کھو کے ہر کوئی کہہ اُٹھا
اسے پھر کہیں بھی نہ پا سکوں

''بشارتِ بے نوا'' کے ذکر نے مجھے اپنے ایک ایسے مرحوم دوست کی یاد دلا دی ہے جس نے اردو افسانہ نگار کے طور پر بہت شہرت کمائی لیکن اپنی وفات کے بعد معاشرے کے ناقابلِ رشک

رویّوں کا شکار ہو کر اک عالمِ بے بسی میں سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

سعید انجم سکول کی ابتدائی جماعتوں سے میرے کلاس فیلو تھے۔ ان کے والد چوہدری غلام حسین صدر انجمن احمدیہ کے افسرِ تعمیرات تھے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر کالج میں ایف اے تک اکٹھے رہے۔ ان کا قد قدرے چھوٹا اور ان کی طبیعت میں تیزی و طرّاری تھی۔ سکول کے زمانے میں تو ان کا ادبی ذوق کھل کر سامنے نہیں آیا لیکن جب وہ کالج پہنچے تو اردو ادب کی بعض معروف کتابیں ان کے ہاتھوں میں نظر آنے لگیں۔ اس زمانے میں "المنار" میں ان کے بعض افسانے شائع ہوئے جن میں سے یہ تین افسانے آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں: "زرد پتے سرخ پھول" "ساکن ہاتھ" اور "کالی پینٹ سفید قمیص، سفید ساڑھی کالا بلاؤز۔"

ہم نے بی اے ایک ساتھ کیا جس کے بعد ان سے رابطہ کمزور پڑ گیا۔ پھر کسی نے بتایا کہ وہ لاہور میں ملازمت کرتے ہیں لیکن کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ میں فنانس سروسز اکیڈمی جوائن کرنے کے بعد ایک دفعہ اپنے کسی کام سے ہال روڈ سے میو ہسپتال کی طرف جا رہا تھا کہ سعید انجم اچانک مل گئے۔ معلوم ہوا کہ اے جی آفس میں کلرک کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک معمولی سے ٹی سٹال پر بیٹھ گئے اور بہت دیر تک پرانی باتیں کرتے رہے لیکن ان کا ایک انوکھا سوال جو مجھے اب تک یاد ہے یہ تھا کہ کیا حکومت کے تربیتی اداروں میں زیرِ تربیت افسران کی واقعی اس انداز میں برین واشنگ کر دی جاتی ہے کہ وہ خود کو عوام سے الگ، کسی بالاتر طبقے کا فرد سمجھنے لگیں۔ میں ان کے سوال کا پس منظر سمجھ رہا تھا۔ وہ گھریلو حالات کی وجہ سے اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے تھے اور بہ امر مجبوری کلرک کی حیثیت میں ملازمت کر رہے تھے۔ انہوں نے کلیریکل سٹاف اور عوام النّاس کے ساتھ افسران کا رویہ دیکھا ہو گا اور اس تلخی کو بھی محسوس کیا ہو گا جس کے ساتھ اس ملک میں ایک عام آدمی کی زندگی بھری ہوتی ہے۔

اس کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ کہیں کھو سے گئے۔ پھر کسی دوست نے ذکر کیا کہ وہ ناروے میں مقیم ہیں۔

ان کے بارے میں مجھے آخری خبر اخبار جنگ کے راولپنڈی ایڈیشن سے ملی جس میں ان کی وفات کی اطلاع تھی۔ اخباری اطلاع کے مطابق ان کی تدفین نماز جنازہ کی ادائی کے بغیر ہوئی۔ مجھے تجسّس رہا کہ وہ کون سے حالات تھے جن کی وجہ سے سعید انجم کا جنازہ پڑھے بغیر ہی انہیں دفن کر دیا گیا۔ میں نے حال ہی میں پرویز پروازی سے اس اطلاع کی تصدیق چاہی تو انہوں نے مجھے بتایا: یہ بات درست ہے۔ میں اُن دنوں اوسلو میں تھا۔ سعید انجم کی وفات کی خبر سن کر میرے سمیت بہت سے احمدی وہاں پہنچ گئے لیکن ان کی اہلیہ جن کا جماعت سے تعلق نہ تھا مصر تھیں کہ احمدی ان کا جنازہ نہ پڑھیں۔ ان کے ایما پر کچھ غیر از جماعت دوست جمع ہو کر نمازِ جنازہ کے لیے صف بندی کر چکے تھے لیکن عین وقت پر ان کے امام نے اس بنیاد پر نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا کہ مرحوم احمدی تھے۔ اب ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ سعید انجم کی اہلیہ ان کا جنازہ غیر احمدیوں سے پڑھانا چاہتی تھیں لیکن وہ اس بات پر آمادہ نہ تھے۔ اسی دوران سعید انجم کے بڑے بھائی رشید نے کہا کہ اس معاملہ کو طول نہ دیا جائے اور بغیر جنازہ پڑھے ان کی تدفین کر دی جائے۔ پرویز پروازی کہتے ہیں: "ساری صورت حال ہمارے سامنے تھی لیکن ہمارے لیے اس جھگڑے میں ٹانگ اڑانا ممکن نہ تھا کیوں کہ ایسا کرنے سے

صورت حال بگڑ سکتی تھی۔ یہ درست ہے کہ سعید انجم سوشلسٹ خیالات رکھتے تھے لیکن اُن کا ایک مخلص احمدی گھرانے سے تعلق تھا اور وہ خود بھی احمدی تھے چنانچہ بعد میں احمدیہ بیت الذکر میں سعید انجم کی نمازِ جنازہ غائب ادا کر دی گئی۔"

سعید انجم ایک کامیاب افسانہ نگار تھے اور ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں: "سب اچھا ہو گا" اور "سوتے جاگتے خواب۔" انہوں نے "نہلے پہ دہلا" کے نام سے ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا جو لاہور آرٹس کونسل کے سٹیج سے پیش کیا گیا اور لاہوریوں کی ایک بڑی تعداد نے اسے دیکھا۔

انٹرنیٹ پر سعید انجم کے بارے میں موجود معلومات کے مطابق انہوں نے Bak Sju Hav بمعنی "سات سمندر پار" کے نام سے ایک فیچر فلم کی ہدایتکاری بھی کی تھی۔ یہ فلم جو لاہور اور اوسلو میں فلمائی گئی تھی اسلم نامی ایک بچے کے گرد گھومتی تھی جس کا والد اسے لاہور میں چھوڑ کر سات سمندر پار چلا جاتا ہے۔ بعد میں اسلم اس کے تعاقب میں خود بھی وہاں جا پہنچتا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں اس فلم کو "بیسٹ نارویجئین فیچر فلم" کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس فلم کو بعد میں بعض اور انعامات بھی ملے چنانچہ اسے یورپین یُوتھ فلِم فیسٹول، بیلجئیم میں پہلا اور سوئٹزرلینڈ کے بچوں کی فلموں کے ایک میلے میں دوسرا انعام ملا۔ اسے ایڈنبرا، شکاگو، ہندوستان، سِڈنی اور جاپان میں بچوں کے بعض فلمی میلوں کے لیے بھی منتخب کیا گیا اور کئی یورپی ممالک کے ٹی وی چینلز نے اس کے حقوقِ نمائش خریدے۔

تعلیم الاسلام کالج میں اردو کے سابق پروفیسر، شیخ محبوب عالم خالد کے سب سے بڑے صاحبزادے، ناصر احمد خالد کی روایت کے مطابق "سعید انجم نے ایک ڈاکومینٹری" بسنت بائی نائٹ" کے نام سے بھی بنائی جس میں دکھایا گیا تھا کہ اس زمانے میں لاہور میں بسنت کا تہوار کس دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ پتنگ بازی، خصوصی طور پر تیار شدہ پیرہن میں ملبوس مرد وزن کا ڈھول کی تھاپ پر رقص، پتنگ کٹنے پر بوکاٹا کے فلک شگاف نعرے اور کلاشنکوف کی تڑتڑ تڑتڑ اور اس موقع پر ہونے والی پر تکلف دعوتیں اور نہ ختم ہونے والا ہلّا گلّا... اس فلم میں یہ سب کچھ دکھایا گیا تھا چنانچہ ناروے اور بعض دیگر یورپی ملکوں میں اسے بے حد پسند کیا گیا۔"

ناصر خالد مزید بتاتے ہیں: "ایک دفعہ میں چوبرجی سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سعید انجم کوئی ڈاکیومینٹری بنا رہے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ پاکستان کے ٹرکوں پر دستاویزی فلم تیار کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اس فلم کو بھی بعض غیر ملکی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔"

جہاں تک سعید انجم کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے نقادوں کی متفقہ رائے ہے کہ وہ ایک خوبصورت افسانہ نگار تھے۔ ایک دفعہ پرویز پروازی سے بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا: سعید انجم کو اردو کے ترقی پسند علامتی افسانہ نگاروں میں بڑا بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اس کا افسانہ "نیک بندوں کا زیور" تو بہت ہی مشہور ہوا تھا۔

ڈاکٹر سعادت سعید نے اپنے مضمون "سینہ گیتی میں نئے دل کے نئے خواب" میں سعید انجم کے فن کا زیادہ تفصیلی احاطہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"سعید انجم ذات پرستی، داخلیت زدگی، مہمل نویسی اور لفظی بازی گری کے امراض میں مبتلا نہیں ہیں۔ ان کے افسانوں اور مضمونوں کا محتاط مطالعہ یہ حقیقت سامنے لاتا ہے کہ انہوں نے اپنے اردگرد سانس لیتے انسانوں کی روحوں میں جھانکا ہے، ماحول کی

پیچیدگیوں اور سماجوں کی تہ داریوں پر نظر رکھی ہے، معانی کی معیّنہ منزلوں کی جانب قدم بڑھائے ہیں اور لفظوں کو اپنے مقاصد کی ترسیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ ان کی تحریر کا ہر لفظ ان کے نقطہ نظر کا گواہ ہے۔ یہی وہ فنی مقام ہے جس پر مکمل گرفت فنکار کی پختگی اور دیانت کی عکاس ہے۔

سعید انجم پختہ نویس بھی ہیں اور دیانتدار بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے قلم کی عصمت پر آنچ نہیں آنے دی۔ لفظوں کی کھلی منڈیوں میں دلّال کی مرضی کا مال نہیں بیچا۔ وہ جہاں کہیں بھی تھے اور جہاں کہیں بھی ہیں اظہارِ صداقت ان کے قلم کا وطیرہ رہا ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں دو قسم کے موضوعات میسر ہیں۔ اپنے وطن کے شہروں، دیہاتوں اور ان کے باسیوں کی وارداتیں، سفید فام ثقافتوں میں رہ کر تیسری دنیا کے حقیقی مسائل کی وضاحتیں، فی الاصل یہ دونوں موضوعات ایک ہی بڑے موضوع کا حصہ ہیں۔ آزاد، خود مختار اور منصفانہ معاشرے کی تلاش!...

سعید انجم نے تیسری دنیا کے باشندوں کی صورت حال پر جس انداز سے اظہارِ رائے کیا ہے اس سے ان کی تخلیقی اور فنکارانہ صلاحیتوں کا سراغ ملتا ہے۔ پیش پا افتادہ کتابی مسائل کو اگر روائتی اور غیر جذباتی مبصر کے اسلوب میں بیان کیا جائے تو نہ ہی فنی تخلیق وجود میں آتی ہے اور نہ ہی قاری کے اعصاب کسی تبدیلی کو قبول کرتے ہیں۔ سعید انجم نے اپنے افسانوں میں اس امر کا بطورِ خاص خیال رکھا ہے کہ وہ مسائل جن پر بار بار قلم اُٹھایا جا چکا ہے پوری پوری جذباتی وابستگی، احساساتی شمولیت اور تخیلاتی مہارت سے معرضِ اظہار میں آئیں۔ سعید انجم کے افسانے ہر نوع کے فسطائیت کا پول کھولتے ہیں۔ وہ طبقاتی نظام کو غیر انسانی نظام جانتے ہیں اور اپنے ارد گرد کے ماحول میں انسانی رجحانات کے رائج ہونے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ترقی پسندی ان کے تخلیقی جوہر کا حصہ ہے۔ سامراج دشمنی ان کے ضمیر کی آواز ہے۔ سعید انجم اس منزل کی تلاش میں ہیں جو وسیع تر آبادیوں کے لیے انصاف کا مسکن ہے۔

انسان دوستی، آزادی پسندی اور عوام دوستی سعید انجم کے نظریات کا لب لباب ہے۔ انہوں نے طویل افسانے بھی لکھے ہیں، مختصر افسانے اور افسانچے بھی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ افسانہ نگاری کے کسی ایک اسلوب پر قناعت نہیں کرتے۔ ان کی افسانوی تحریریں علامتی بھی ہیں، بیانیہ بھی اور کرداری بھی۔ وہ اساطیری اشاروں سے بھی کام لیتے ہیں، فوٹو گرافی سے بھی، ان کے ہاں ڈائیلاگ بھی دستیاب ہے اور ڈرامائی سچوایشنز بھی، سادہ نویسی بھی ہے اور پُر پیچ اظہار بھی، ان کا مشاہدہ بھرپور ہے اور تجربہ وسیع... وہ جس بھی ماحول کا افسانہ لکھتے ہیں اس کو جزئیات سمیت گرفت میں لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات متنوّع ہیں۔ دیہات کے حوالے سے سادہ لوحی، توہّم پرستی، معصومیت، انسان سے انسان کا پیار، غربت، بیچارگی، اقتصادی ناہمواری، شہر کے حوالے سے متوسط طبقے کی چالیں، سٹیٹس کی تبدیلی کی طمع، بزدلی، بے معنویت، سرمایہ دارانہ ثقافت، دولت کی ریلے ریس... والے مسائل ہیں۔"

اگرچہ سعید انجم کے فن کے بارے میں بہت کچھ کہنے کو باقی ہے لیکن ان کا ذکر موقوف کرتے ہوئے کچھ طاہر احمد عرف طاہری کے بارے میں جو مولوی فضل دین وکیل کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مولوی فضل دین تایا اسحق کے ہم زلف تھے لہٰذا طاہری کے ساتھ تعلق کی ایک وجہ یہ رشتہ داری بھی تھی تاہم اصل وجہ یہ تھی کہ ہم احمدیت کے رشتے میں

پروئے ہوئے تھے، ہمارے بزرگان ایک دوسرے کے ساتھ مراسم محبت رکھتے تھے اور ایک مرحلہ پر ہماری رہائش بھی قریب قریب تھی۔ ان سب سے بڑھ کر طاہری شروع سے میرے کلاس فیلو تھے اور ہم ایک دوسرے کی کمزوریوں اور خوبیوں سے بہت حد تک واقف تھے لہٰذا ایک دوسرے کے ساتھ گہرے مراسم رکھتے تھے۔

ہمارے ایک کلاس فیلو جاوید احمد المعروف گوگا جوبی ٹی صاحب کے صاحبزادے تھے طاہری کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ طاہری اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی پُر خلوص نکلے چنانچہ انہوں نے اپنے دوست کا نام اپنے نام کا حصہ بنالیا۔ وہ طاہر احمد سے طاہر احمد جاوید بن چکے تھے اگرچہ نہ معلوم کیوں جاوید نے طاہری کے نام کو اپنے نام کا حصہ نہیں بنایا۔

میٹرک کے بعد انہوں نے پری انجینئرنگ گروپ میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایف ایس سی کرتے ہی انہیں نیوی میں کمشن مل گیا اور وہ ۱۹۹۵ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک وہیں رہے۔ اس عرصے میں وہ کیپٹن کے عہدے پر پہنچ چکے تھے۔

ان کی شادی محلہ دارالصدر شمالی کے ایک مکین چوہدری محمد امین (جو تعلیم الاسلام کالج والے چوہدری محفوظ الرحمن کے ہم زلف تھے) کی صاحبزادی منصورہ سے ہوئی اور انہوں نے بفضلہ تعالیٰ ایک خوشگوار عائلی زندگی بسر کی۔

میں ۱۹۸۹ء کے آخر میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن، پشاور میں زیر تربیت تھا۔ میرے ساتھ مختلف محکموں کے گریڈ ۱۹ کے افسران کی ایک بڑی تعداد بھی ٹریننگ حاصل کر رہی تھی۔ اس دوران ہمیں ایک مطالعاتی دورہ پر کراچی لے جایا گیا۔ یوں تو سرکاری طور پر ہماری مصروفیات طے شدہ تھیں لیکن سب دوستوں کی خواہش تھی کہ ہم اپنے طور پر کوئی آب دوز بھی دیکھیں۔ یہ کام نیوی کے کسی افسر کے تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے طاہری سے فون پر بات کی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ اس حوالے سے جملہ انتظامات کرلیں گے تاہم ہماری دیگر مصروفیات کی وجہ سے یہ پروگرام حتمی شکل اختیار نہ کر سکا۔ اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں اپنے طور پر کوئی آبدوز پہلی بار تین چار سال بعد دیکھ پاؤں گا اور وہ بھی ایک ایسی آبدوز جسے جرمنی نے دوسری جنگ عظیم کے دوران دشمن کے خلاف استعمال کیا تھا اور اب وہ جرمنی کے شہر کیل میں ایک میوزیم میں محفوظ ہے۔

انہیں نیوی میں اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بناپر حکومت کی طرف سے اعزاز سے نوازا گیا۔ میری خواہش تھی کہ میں یہاں وہ سائٹیشن نقل کرتا جس میں حکومت کی طرف سے ان کی کارکردگی کا اعتراف کیا گیا تھا لیکن افسوس ان کی اہلیہ کی کوشش باوجود یہ دستاویز دستیاب ہو سکی نہ طاہری کے بعض احمدی رفقا اس سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکے۔

طاہری نے ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کی اور پھر اپنا کاروبار لیکن انہیں یہ کاروبار راس نہ آیا۔

انہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل مجھے ایک خط لکھا جس میں انہوں نے ذکر کیا تھا کہ ان کی ایک خطیر رقم کسی آدمی کے پاس پھنسی ہوئی ہے اور وہ اس میں سے کچھ بھی واپس کرنے کو تیار نہیں۔ یہ آدمی لاہور میں اپنا کاروبار کر رہا تھا اور میری تعیناتی اسی شہر میں محکمہ انکم ٹیکس کے سربراہ کے طور پر تھی۔ طاہری کا خیال تھا کہ میرے ذریعہ ان کی ڈوبی ہوئی یہ رقم بہ آسانی وصول ہو سکتی ہے لیکن

افسوس میں ان کی خاطر خواہ مدد نہ کر سکا۔ طاہری کو صرف جزوی وصولی پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔

یہی وہ سال تھا جب ان کی اچانک وفات ہو گئی۔ ہارٹ اٹیک تو انہیں ایک بار پہلے بھی ہو چکا تھا لیکن دوبارہ اس کے آثار عین اس موقع پر ظاہر ہوئے جب ان کی بڑی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی اور وہ اس کے انتظامات میں مصروف تھے۔ انہوں نے تکلیف کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بیٹی کی شادی کے فوراً بعد انہیں دل کا شدید حملہ ہوا اور وہ طبی امداد ملنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

یہ واقعہ ۲۰ دسمبر ۲۰۰۴ء کا ہے، میری ریٹائرمنٹ کے ٹھیک دو دن بعد کا۔ طاہری کو باغِ احمد میں دفن کیا گیا۔ جی ہاں! باغ احمد میں کہ کراچی میں احمدیوں کے قبرستان کا یہی نام ہے۔ طاہری کے پسماندگان میں سے ان کی بیوہ منصورہ طاہر، دو بیٹے نعمان طاہر اور حسن طاہر اور دو بیٹیاں مدیحہ اور حنا ہیں۔

طاہری کا ذکر ہو رہا ہو یا کسی اور مرحوم دوست کا، نصرت الٰہی خود بخود میرے ذہن کے کسی بند دریچے میں سے اچانک جھانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ سکول کے آخری سالوں میں ہمارے ساتھ آ شامل ہونے والے نصرت الٰہی مربی سلسلہ فضل الٰہی انوری کے چھوٹے بھائی تھے اور محلہ دارالبرکات میں کسی جگہ مقیم تھے۔ چھوٹے قد اور چوڑے چکلے سینے والے نصرت الٰہی کے دیہاتی لہجے میں بھی ایک خاص کھنک تھی۔ غالباً بھیرہ کے اطراف سے ربوہ آئے تھے اور محنتی طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ ہم انٹر میڈیٹ تک ایک ساتھ رہے۔ پھر انہوں نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور مکینکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ میں اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور ان دونوں یونیورسٹیوں کے درمیان بُعد المشرقین تھا لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ہماری ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد کچھ عرصہ تو ان سے رابطہ رہا مگر پھر یہ رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

میں سنتا رہتا تھا کہ وہ شاہ تاج شوگر ملز، منڈی بہاؤالدین میں ملازم ہیں اور موٹروے کی تعمیر سے پہلے راولپنڈی سے ربوہ جاتے ہوئے کبھی کبھار وہاں سے میرا گذر ہوتا تھا لیکن قلتِ وقت کے سبب ان سے ملاقات ہمیشہ مؤخر کر دیتا رہا۔ ایک بار میں پروگرام بنا کر ملز کے جنرل منیجر، وحید قریشی کے ہاں تھوڑی دیر کے لیے رکا اور ان کے ذریعہ نصرت الٰہی کا پتا کرایا لیکن وہ اتفاقاً منڈی بہاؤالدین سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پھر بوجوہ یہ راستہ بھی میرے لیے "آؤٹ آف دی وے" ہو گیا لیکن ہمیشہ یہی خیال رہا کہ نصرت الٰہی سے ملنا کیا مشکل ہے، کسی روز مل ہی لیں گے۔ بس یہی سوچتے سوچتے ۲۰۱۱ء آ گیا۔ ایک روز میں نے فضل الٰہی انوری سے نصرت الٰہی کا پتا مانگا تو انہوں نے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ وہ تو کئی سال پہلے وفات پا گئے تھے۔ میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ "لیکن کیسے؟" میں نے قدرے حیرت سے سوال کیا۔

"کیا موت کی بھی کوئی وجہ ہوتی ہے؟" انہوں نے مجھے جواباً کہا "بس اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔"

"کہاں ہوتے ہیں ان کے بیوی بچے؟"

"واہ کینٹ میں کسی جگہ۔ بڑے بیٹے کا نام ہمایوں ہے اور میں اس کا ٹیلی فون نمبر دے سکتا ہوں۔"

جب میں نے ان کے فراہم کردہ نمبر پر بات کی تو خدا کا شکر

ہے ہمایوں سے بات ہو گئی۔ ای میل نے اس رابطے میں مزید سہولت پیدا کر دی۔ معلوم ہوا کہ نصرت الٰہی نے اپنی ملازمت کا آغاز توستارہ گھی ملز، فیصل آباد سے کیا تھا اور وہ ایک سال پاکستان چِپ بورڈ فیکٹری جہلم میں بھی رہے لیکن ان کی ملازمت کا سب سے طویل دورانیہ جو ربع صدی پر محیط تھا شاہ تاج شوگر ملز میں گذرا۔ وہ اشرف شوگر ملز بہاولپور میں بھی رہے، چشتیاں شوگر ملز میں بھی کام کیا اور آخر میں راجن پور چلے گئے لیکن جہاں بھی رہے انہوں نے اپنی محنت، دیانتداری اور خلوص سے لوگوں کے دل میں گھر کئے رکھا۔

ہمایوں کا بیان ہے کہ نصرت الٰہی کو قرآن پاک کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ انہوں نے تمام زندگی بیت الذکر سے رابطہ رکھا اور اولاد کو بھی اس کا عادی بنایا۔ انہوں نے کبھی کوئی نمازِ جمعہ نہیں چھوڑی نہ اولاد کو اس کی اجازت دی۔ وہ غریبوں کے ہمدرد تھے اور اپنے ماتحتوں کے لیے ایک مُشفق باس۔

"ان کی وفات کے بارے میں کچھ بتایئے!" میں نے ان سے فرمائش کی۔

"جب وہ چشتیاں شوگر ملز میں تھے تو انہیں پہلی بار دل کا حملہ ہوا لیکن انہوں نے ابھی کچھ اور جینا تھا سو وہ اس تکلیف سے باہر نکل آئے تاہم بحالی صحت کی خاطر یہ ملازمت ہی چھوڑ دی اور پورا ایک سال آرام کرنے کے بعد راجن پور میں ملازمت شروع کر دی۔ وہاں تقریباً نو ماہ رہے۔ ان کے باس ان کی محنت اور فرض شناسی کے باعث ان سے بہت خوش تھے لیکن اسی دوران انہیں دوبارہ ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں عطیہ کر رکھی تھیں چنانچہ ان کی وفات کے فوراً بعد نور العین کی ایک ٹیم نے ضروری کارروائی مکمل کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس قربانی کے نتیجہ میں بینائی سے محروم دو افراد کو بصارت کی نعمت سے سرفراز فرمادیا۔

نصرت الٰہی ۸ جولائی ۲۰۰۴ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ ان کی تدفین اس سے اگلے روز واہ کینٹ میں عمل میں آئی۔

خالق، حمید، سمیع، صادق، بشارت جمیل، سعید انجم، طاہری اور نصرت الٰہی، یہ سب تو ہمارے اس زمانے کے دوست تھے جب ہمیں ناک پونچھنا بھی نہ آتا تھا۔ تعلیم الاسلام کالج میں ہمارے ساتھ داخلہ لینے والوں میں سے ایک محمد سلیمان تھے جو قصور سے میٹرک کر کے آئے تھے۔ تھے تو پری میڈکل کے سٹوڈنٹ لیکن ان سے علیک سلیک رہتی تھی۔ بدقسمتی سے ایف ایس سی کے نتیجہ کی بنیاد پر ان کا میڈکل کالج میں داخلے کا خواب پورا نہ ہو سکا تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری چنانچہ بی ایس سی کے بعد انہیں ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی میں داخلہ مل گیا۔ پھر ان کی مائیگریشن کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں ہو گئی جہاں سے انہوں نے ۱۹۷۰ء میں گریجوایشن کی۔

اپنے اپنے جھمیلوں میں پڑ کر کئی سال تک ہمارا رابطہ منقطع رہا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب میں فیصل آباد میں تھا ان سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ تکمیل تعلیم کے بعد دو سال فوج میں رہے اور پھر ایران چلے گئے جہاں انہوں نے کئی سال گذارے۔ وطن واپس آ کر سوشل سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کر لی اور جب ہماری ملاقات ہوئی وہ فیصل آباد کے پیپلز کالونی میں واقع اسی محکمہ کے ہسپتال میں ماہرِ امراضِ بچگان کے طور پر کام کر رہے تھے۔ یاد رہے انہوں نے یہ تخصیص آسٹریا سے حاصل کی تھی۔

ان کی شادی سفینہ پرنٹ والے شیخ محمد عبداللہ کی صاحبزادی بلقیس اختر سے ہوئی تھی جو پنجاب یونیورسٹی میں راشدہ کی کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ یوں ہماری ایک دوسرے کے ساتھ بکثرت

ملاقاتیں ہونے لگیں اور جب میں راولپنڈی چلا گیا تو بھی فون پر ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ برقرار رہا۔

ایک بار مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا۔ ان کا ایک گردہ بیکار ہو گیا تھا چنانچہ راولپنڈی کے ایک پرائیویٹ ہسپتال "کِڈنی سنٹر" میں ان کا کِڈنی ٹرانسپلانٹ ہوا تاہم ہسپتال کی انتظامیہ اداشدہ فیس کی باضابطہ رسید جاری کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ڈاکٹر سلیمان اپنے علاج پر اُٹھنے والا خرچ اپنے محکمہ سے وصول کرنا چاہتے تھے اور باضابطہ رسید کی عدم موجودگی میں انہیں رقم کی واپسی میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ اس سلسلے میں میری مدد کے طلبگار تھے۔ خدا کا شکر ہے میں نے کسی نہ کسی طرح انتظامیہ کو یہ رسید جاری کرنے پر آمادہ کر لیا۔

چند سال پہلے ان کے ایک ہم زلف شیخ ظفر احمد سے ملاقات میں ڈاکٹر سلیمان کا ذکر خیر بھی آ گیا۔ تب مجھ پر یہ افسوسناک انکشاف ہوا کہ وہ تو وفات پا چکے ہیں۔

"کب وفات ہوئی ان کی؟" میں نے مکرر تصدیق چاہی۔

"۳۰ نومبر ۲۰۰۳ء کو اور ان کی تدفین احمدیہ قبرستان، گھوکھووال میں ہوئی" انہوں نے جواب دیا۔

"ہوا کیا تھا انہیں؟"

"کِڈنی ٹرانسپلانٹ کے وقت انہیں بتا دیا گیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دس سال تک اس گردے پر انحصار کر سکتے ہیں۔ آپریشن ۱۹۹۴ء میں ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس گردے کا فنکشن کمزور پڑتا گیا۔ مزید ٹرانسپلانٹ طبی وجوہ کی بنا پر ممکن نہ تھا۔ یہی تکلیف ان کی وفات کا سبب بن گئی۔"

ان کے بیٹے احسن سے بات ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے: "میرے والد بہت عظیم انسان تھے" احسن کہہ رہے تھے "بہت نیک اور حد درجہ دیانتدار۔ ان کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے انہیں ہسپتال کے لیے ادویہ کی خریداری کی ذمہ داری سونپی تو انہوں نے اسے بہت ہچکچاتے ہوئے قبول کیا۔ پاکستان میں ادویہ کی خریداری میں گھپلے کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ سپلائرز نے انہیں اپنے راستہ پر لگانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن والد صاحب نے ان کے سارے ہتھکنڈے ناکام بنا دیئے۔"

ڈاکٹر سلیمان کے بعد اب کچھ ذکر سید شمشاد علی کا جو مربی سلسلہ، سید منیر احمد باہری کے برادرِ نسبتی تھے اور فرسٹ ائیر میں ہمارے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) کے طالب علم تھے لیکن ہمارے انگریزی اور اُردو کے پیریڈ اکٹھے ہوتے تھے لہٰذا آہستہ آہستہ ہماری ان سے بے تکلفی ہو گئی۔ ایف ایس سی میں وہ اتنے نمبر حاصل نہ کر سکے کہ انہیں انجینئرنگ کالج میں داخلہ مل سکتا لہٰذا وہ آرٹس کی طرف آ گئے اور بی اے میں داخلہ لے لیا۔

شمشاد علی سید پُروقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی رنگت صاف، قد لمبا اور گفتگو میں شستگی تھی۔ وہ بی اے میں اردو ایڈوانس پڑھنے والے معدودے چند طلبہ میں سے ہونے کے ناطے اردو سوسائٹی کے نائب صدر اور بعد میں صدر بھی رہے۔

ہم بی اے کے پہلے سال میں تھے جب اردو سوسائٹی کا افتتاحی اجلاس ان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اُس سال مبارک عابد اس سوسائٹی کے سیکرٹری تھے اور مہمانِ خصوصی زرعی یونیورسٹی، لائلپور کے وائس چانسلر، زیڈ اے ہاشمی۔ اس تقریب میں مہمانِ خصوصی نے تعلیم الاسلام کالج اور جماعت کی طرف سے اردو زبان

کی خدمات کی دل کھول کر تعریف کی تھی۔

۱۹۶۴ء میں کالج کے زیر اہتمام پہلی اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں مُلک کے بہت سے نامور ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی تھی۔ اگرچہ اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت مہمان ادیبوں نے کی تھی لیکن شمشاد علی سید مجلس انتظامیہ کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً سٹیج پر نظر آتے رہے۔

بی اے کے امتحان میں ان کی فرسٹ ڈویژن صرف ایک نمبر سے رہ گئی تھی۔ وہ اس بات پر کافی ملُول تھے۔ ہم بھی انہیں تسلی دینے والوں میں سے تھے لیکن انہیں اپنی اس مایوسی کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرنا پڑا۔

انہوں نے تکمیلِ تعلیم کے بعد غالباً الائیڈ بنک آف پاکستان میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ اس عرصے میں ان کی تعیناتی جہلم اور لاہور سمیت مختلف جگہوں پر رہی۔ وہ اپنے حالات پر بظاہر مطمئن نظر آتے تھے۔

برسوں پہلے اچانک ان کی وفات کی خبر سنی مگر فوری طور پر اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔ دو تین سال پہلے منیر باہری سے اس واقعہ کی تفصیلات سن کر دُکھ ہوا۔ شمشاد نے جماعت سے باہر شادی کی تھی چنانچہ ان کی بیوہ بضد تھیں کہ احمدی مرحوم کا جنازہ نہ پڑھیں۔ انہیں بمشکل تمام اس بات پر رضامند کیا گیا جس کے بعد مرحوم کے چند احمدی رشتہ داروں نے جو اس موقع پر اکٹھے ہو گئے تھے تقریباً چُھپ کر ان کا جنازہ پڑھا اور باقی ساری کارروائی ان کی بیوہ کے رشتہ داروں نے اپنے رواج کے مطابق کی۔

ان کی تدفین لاہور میں ہوئی۔

اب آخر میں کچھ ذکر ایک اور مرحوم دوست، نعیم احمد کا جو حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے برادرِ اکبر حکیم غلام احمد کے پڑپوتے اور ڈاکٹر قریشی محمد عبد اللہ کے صاحبزادے تھے۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں ڈاکٹر عبداللہ چنیوٹ میں پریکٹس کیا کرتے تھے لیکن ان کی رہائش فضل عمر ہسپتال کے پیچھے پولیس تھانے کے آس پاس تھی۔ دھیمے مزاج کے شریف النفس انسان تھے اور ان کی یہی خوبی ان کے فرزند نعیم میں آئی تھی۔

نعیم سنٹرل ماڈل ہائی سکول، لاہور سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایف اے کرنے کے بعد تعلیم الاسلام کالج میں آئے تھے۔ ہم نے بی اے ایک ساتھ کیا بلکہ ہمارے بعض مضامین بھی مشترک تھے۔ بعد میں انہوں نے بھی میری طرح سیاسیات میں ایم اے کیا لیکن گورنمنٹ کالج لاہور سے۔

ایم اے کرنے کے کچھ عرصہ بعد تک ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن پھر تلاشِ معاش کی اُلجھنوں نے یہ رابطہ تقریباً منقطع کر دیا۔ ایک بار نہ جانے کس نے ذکر کیا کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔

"اناللہ وانا الیہ راجعون! لیکن انہیں ہوا کیا تھا" میں نے ان کی والدہ سے پہلا سوال یہی کیا۔

"کیا عرض کروں!" دوسری طرف سے جواب آیا "اسے دس سال کی عمر میں رئیومیٹک فیور ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا دل بڑھ چکا تھا۔ اس پر اس تکلیف کا اثر ساری عمر رہا۔ جون ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ ہم لوگ کُنری میں تھے کہ اس کی بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ اسے حیدر آباد کے ایک ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ہر ممکن علاج ہوا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا اور اس کے ساتھ

دیکھا آخر اس دل کی بیماری نے کام تمام کیا

والا معاملہ ہوا۔ ۹ جون ۱۹۷۸ء کو وہ ہم سب کو روتا پیٹتا چھوڑ کر

چلا گیا۔"

"کتنی عمر پائی انہوں نے؟"

"صرف بتیس سال۔ وہ اتنی ہی عمر لے کر آیا تھا۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟"

"جی ارشاد! میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"اس کا ابھی بچپن تھا۔ ہماری رہائش سندھ میں تھی۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ ہم نعیم کو لکڑی کی پیٹی میں ڈال کر ربوہ لے جا رہے ہیں۔ میں تو ڈر ہی گئی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ خواب سنایا۔ انہوں نے بھی اس خواب کو منذر سمجھ کر فوری طور پر ایک بکرا صدقہ کر دیا۔ اس وقت تو اللہ تعالیٰ نے نعیم کو بچا لیا لیکن اب یہ خواب من وعن پورا ہو گیا۔ نعیم موصی تھا اور اس کی وفات حیدر آباد میں ہوئی تھی چنانچہ ہم اسے لکڑی کے تابوت میں بند کر کے ربوہ لے گئے۔ الحمد للہ اس کا حساب صاف تھا بلکہ اس کی طرف سے کچھ فاضل ادائی بھی ہو چکی تھی چنانچہ بہشتی مقبرہ میں تدفین کی فوری طور پر اجازت مل گئی۔

مرحوم نے اُس وقت وصیت کی تھی جب وہ فورتھ ایئر میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ اس عمر میں نظامِ وصیت میں شمولیت ان کی نیکی کے علاوہ نظامِ سلسلہ کے ساتھ ان کی پختہ وابستگی کی علامت ہے۔

ان کی وفات پر پینتیس سال گذر چکے ہیں لیکن نعیم کا مسکراتا ہوا چہرہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا تو وہ مبارکباد کے لیے خاص طور پر ہمارے گھر آئے تھے اور ان کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔

ڈاکٹر عبد اللہ تو نعیم کی وفات کے چند ہی سال بعد اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن ان کی والدہ، جمیلہ خانم جو شیخ منیر احمد، سابق امیر جماعت احمدیہ لاہور کی حقیقی ہمشیرہ تھیں لمبا عرصہ بقیدِ حیات رہیں اور انہوں نے حال ہی میں وفات پائی ہے۔ "بڑا ہی سعادت مند تھا میرا بیٹا" ایک بار انہوں نے مجھے بتایا تھا" میری ذرا سی تکلیف پر مضطرب ہو جایا کرتا تھا۔ ربوہ کی بات ہے۔ ایک بار رات کے وقت میرے پیٹ میں اچانک درد اُٹھا۔ وہ بھاگ کر حکیم خورشید احمد کے پاس گیا اور دوا لے کر آیا۔ میں اسے کہتی رہی کہ وہ جا کر آرام کر لے، میں ٹھیک ہو جاؤں گی لیکن وہ اس وقت تک میرے پاس بیٹھا رہا جب تک میں خود اپنی نیند سو نہیں گئی۔ اس کی مخلوقِ خدا سے ہمدردی کے کئی واقعات میرے ذہن میں ہیں۔ بچپن ہی سے صحبتِ صالحین کا شوق رکھتا تھا اور مولانا غلام رسول راجیکی کا تو بے حد عقیدت مند تھا۔"

یہ تو تھا ہمارے ان ہم جماعتوں میں سے بعض کا ذکرِ خیر جو ہمیں راستے میں چھوڑ کر خود راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے لیکن خدا کے فضل سے ہمارے بہت سے ساتھی حیات ہیں اور ماشاء اللہ فعّال زندگی گذار رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ پاکستان میں ہیں تو بعض دُور دراز ملکوں میں جا بسے ہیں لیکن سچ پوچھیں تو آج بھی ہم ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب ہیں جتنے سکول یا کالج کے زمانہ میں تھے۔

میاں حبیب الرحمن ساحرؔ صاحب وفات پاگئے

انا للہ وانا الیہ راجعون
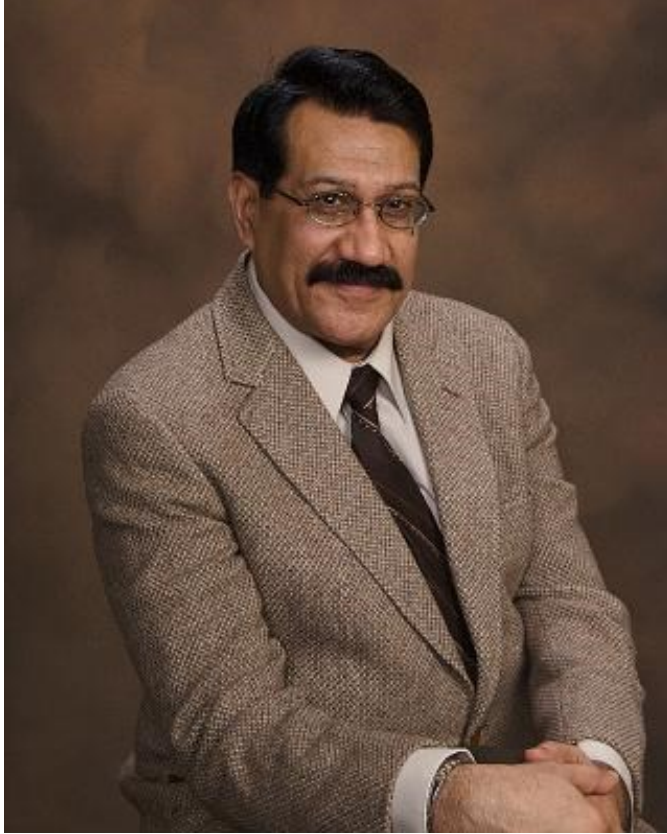
مرحوم کے شاگردوں، دوستوں، محبوں اور افراد جماعت کی خدمت میں اطلاعاً عرض ہے کہ میاں حبیب الرحمن ساحرؔ جو کچھ عرصہ سے کولن کینسر کے عارضہ میں مبتلا تھے 21/فروری 2015 کو ہوسٹن میں وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگلے دن آسٹن / راونڈ راک کی احمدیہ مسجد کے احاطہ میں مرحوم کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اسی روز جارج ٹاؤن کے قبرستان دارالمغفرۃ میں تدفین ہوئی۔ قبر تیار ہونے پر لطف الرحمان محمود صاحب نے دعا کروائی۔ مرحوم نے اہلیہ کے علاوہ دو لڑکے، عطاء الرحمن اور نوید رحمان اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ پہلی بیگم سے ایک بیٹی ثوبیہ کرن ہیں جو شادی شدہ ہیں، پاکستان رہتی ہیں۔

میاں صاحب مرحوم 7/مارچ 1949ء کو بھیرہ میں پروفیسر میاں عطاء الرحمن صاحب (آف تعلیم الاسلام کالج) کے ہاں پیدا ہوئے۔ ربوہ کے تعلیمی اداروں سے استفادہ کیا۔ تعلیم الاسلام کالج سے فزکس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد 1972ء سے 1984ء تک اسی کالج میں پڑھاتے رہے۔ 1984ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی اجازت سے امریکہ آگئے۔ یہاں آکر Health Physics کے شعبہ میں یونیورسٹی آف منی ایپلس / منی سوٹا اور یونیورسٹی آف وسکانس، Wayne state یونیورسٹی ڈیٹرائٹ سے ڈاکٹریٹ مکمل کی۔ اس کے بعد تعلیم و تدریس کے شعبے سے منسلک ہوگئے۔ جولائی 2014ء میں ریٹائرمنٹ لے لی۔ کچھ عرصہ کولن کینسر کے مرض میں مبتلا رہنے کے بعد 21/فروری 2015ء کو ہوسٹن کے ہسپتال میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مکرم میاں صاحب کو واقف زندگی اور موصی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے اہل و عیال کا دین و دنیا میں حافظ و ناصر اور متکفل ہو۔ آمین

مرحوم حبیب الرحمن ساحرؔ صاحب ایک ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ مرحوم نے منظومات کے چار غیر مطبوعہ مجموعے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ میاں صاحب مرحوم کی کمی ان کے وسیع حلقہ واحباب میں دیر تک محسوس کی جاتی رہے گی۔

غزل

محمد خالد
(پاکستان)

ڈھونڈنے نکلے تو تھے شہروں میں ویرانوں میں بھی
کیسے ملتا جو نہ تھا گزرے ہوئے لمحوں میں بھی

ہاں! خریداری کا ہے کس کو سلیقہ ان دنوں
بیچنے والے بہت بیٹھے ہیں بازاروں میں بھی

جس کی خاطر سینکڑوں اوراقِ گُل نوچے گئے
پڑھ لیا وہ راز میں نے زردرُو پتوں میں بھی

صرف مجھ پر کیوں تیری چاہت کا الزام آئے گا
پیار کا انداز تھا جب کہ تری باتوں میں بھی

گِر گئی ہیں میری بوسیدہ چھتیں خالدؔ تو کیا؟
زلزلہ آیا ہے اُس کے گھر کی دیواروں میں بھی

نظم

ڈاکٹر ابرار احمد
(پاکستان)

اس سے ملنا تھا بہت دیر لگا دی تم نے
اے مری عمر!
بہت دیر لگا دی تم نے
میں نے سوچا تھا کہ اس کارگہ ہستی میں
چند سانس اپنی فراغت کے گھنے سائے میں
کھینچ پاؤں تو اسی سمت چلا جاؤں گا
میں نے سوچا تھا کہ اس موڑ تلک جاؤں گا
جس سے رستے، ابدیت کی طرف مڑتے ہیں
اور موجود کی ذلّت سے پرے
دشت امکاں میں
درختوں سے لپٹ جاؤں گا
اپنے دن رات کے لفظوں کی کھلی بارش میں
بھیگ جاؤں گا،
اسی نام کے سائے سائے
چلتا جاؤں گا بہت دور تلک
وقت روٹھا ہوا بچہ ہے
منا لوں گا
تو نے اے عمر!
سنبھلنے نہ دیا
اپنی غفلت کی تھکاوٹ سے نکلنے نہ دیا
خواب کے بیچ، جو اک اسم کا دروازہ تھا
کھولتے کھولتے ہر سانس گنوا دی میں نے
اے مری عمر.....
بہت دیر لگا دی تم نے...

غزل

جمیل الرحمان
(برطانیہ)

نفس امارہ ترا خانہ خراب
تُو نے کر ڈالا مرا خانہ خراب

ہو چکا ہے شل مرا سارا بدن
یوں نہ دے بانگ درا خانہ خراب

تُو نے جو فتنہ اُٹھانا ہے اُٹھا
اس طرح تو مت ڈرا خانہ خراب

مجھ پہ کیا ہنستا ہے اس دنیا پہ رو
یہ ہے عبرت کی سرا خانہ خراب

آسماں کیوں دے رہا ہے یہ صدا
اس طرف تو آ ذرا خانہ خراب

خلوتی ہو کر محبت سے گریز
کیا یہی ہے دیں ترا خانہ خراب

ان سُنی کرنے سے کیا ہو گا جمیلؔ
کچھ علاج دل کرا خانہ خراب

غزل

اکرم محمود
(میری لینڈ)

نشانِ بے نشانی بھی وہیں پر چھوڑ آیا ہوں
میں ان آنکھوں کا پانی بھی وہیں پر چھوڑ آیا ہوں

وہ ایک ساتھی ستارہ بھی اُفق پر اب نہیں آتا
وہ عکس ارغوانی بھی وہیں پر چھوڑ آیا ہوں

وہ رنج رائیگانی ساتھ لانے سے بھی کیا ہوتا
تِری اپنی کہانی بھی وہیں پر چھوڑ آیا ہوں

سمندر پار کرنا تھا، خزانے ساتھ کیا لاتا
سو میں لفظ و معانی بھی وہیں پر چھوڑ آیا ہوں

نہیں لایا میں ساتھ اپنے وہ جگنو اور ستارے بھی
نظامِ ترجمانی بھی وہیں پر چھوڑ آیا ہوں

جہاں میں کیسہء درویش خالی کرکے آیا تھا
تمہاری راجدھانی بھی وہیں پر چھوڑ آیا ہوں

نہ تھا ممکن کہ وہ دہلیز اپنے ساتھ لے آتا
بزرگوں کی نشانی بھی وہیں پر چھوڑ آیا ہوں

غزل

عاصم صحرائی

رات بھر لرزا تھا پلکوں پہ ستارا کس لیے
میری آنکھوں میں اُمڈ آیا تھا دریا کس لیے

شام ہوتے ہی مقفّل ہو گئے تھے سارے لوگ
رات بھر رقصاں رہا گلیوں میں سایہ کس لیے

جس کو میری بات کا ہر لفظ کھٹکا تھا کبھی
میری باتوں پر یقیں اب اس کو آیا کس لیے

میں تو اک مدّت سے اپنی ذات میں روپوش تھا
ڈھونڈنے والو، بتاؤ، تم نے ڈھونڈا کس لیے

جُھر جُھری سی ایک بدن میں آ گئی یہ سوچ کر
اپنا کتبہ اپنے ہاتھوں میں نے لکھا کس لیے

ہو جو اوروں کا تماشا دیکھنے نکلے تھے آج
بن گئے اپنی نظر میں خود تماشا کس لیے

جس نے عاصؔم اپنے گھر سے کل نکالا تھا مجھے
آج آخر میرے گھر میں خود وہ آیا کس لیے

Book Extract:
Islam in the African American Experience by Richard Brent Turner

THE AHMADIYYA'S EARLY DAYS IN AMERICA

Safir Rammah

On January 24, 1920, as daybreak settled over London's streets, an elderly, light-brown-complexioned man with spectacles boarded the S. S. Haverford bound for America. His dark green and gold turban and his amiable but mysterious manner attracted the attention of several Chinese passengers, to whom he introduced himself as "Mufti Muhammad Sadiq, missionary for the Ahmadiyya Movement in Islam." Each day at sea, several passengers were eager to learn more about this exotic stranger's religion and his plans for a Muslim mission in America. They were mystified by his stories about the life of the Prophet Muhammad and the teachings of the Promised Messiah Ghulam Ahmad, which he told in English, interspersed with Arabic and Urdu phrases. "Say, if you love Allah, follow me; then will Allah love you," he said. "There is no God but Allah, and Muhammad is a Messenger of God." Before the end of the voyage, Sadiq had converted four Chinese men, one American, one Syrian, and one Yugoslavian to Islam.

The S. S. Haverford arrived in Philadelphia on February 15, 1920. The United States immigration authorities seized Mufti Muhammad Sadiq and took him into custody before he could leave the ship, although he assured them that "he had not come here to teach plurality of wives." After they had interrogated him for several hours and had established that he was a citizen of India and a representative of a religious group that practiced polygamy, the authorities asked him to leave the United States on the ship in which he had just ar-

rived. Sadiq refused to do so and requested an appeal to the Secretariat in Washington, D.C. He was confined to the Philadelphia Detention House in Gloucester, New Jersey, until a favorable decision of the appeal was handed down several weeks later.l6

Many men in the Detention House were impressed with Sadiq's passion and devotion to his multi-racial religion, which offered dramatic changes in name and identity, and they converted. "Under curious circumstances, we got acquainted in the closed walls of the Detention House," Sadiq said of his first convert in America, R. J. H. Rochford. "Watching me praying and reciting the Holy Book, Mr. Rochford inquired of my religion, which I explained to him and I gave him some books to study. Very soon he was convinced of the truth of our religion and being converted was named Hamid." Although Rochford was eventually sent back to England by the immigration authorities, during those weeks of confinement Sadiq made nineteen other converts to Islam. These men were from Jamaica, British Guyana, Azores, Poland, Russia, Germany, Belgium, Portugal, Italy, and France. Thus, Sadiq's mission was at first generalized and only later focused almost exclusively on African Americans.

Sadiq's tone during his confinement was conciliatory, as he attempted to convince the federal authorities that the could preach Islam in the United States without preaching polygamy. To do so, Sadiq made a distinction between commandments and permissions in Islam. Muslims must follow the commandments of their religion, he explained, but might avoid the permissions. For instance, no government could persuade a Muslim to worship more than one God, since the worship of one God was a commandment of Islamic religion. However, polygamy was permitted only in countries whose laws sanctioned its practice. In countries that prohibited polygamy, permission for its practice was disallowed under the commandment that all Muslims must obey the laws of the country in which they lived.20

But if Sadiq was conciliatory, others were not so sanguine. The Ahmadiyya Movement in Islam expressed its outrage over Sadiq's detention, an outrage which Sadiq would share by the end of 1921. It cited in The Review of Religions the gap between America's ideas of freedom, justice, and equality and the nation's actual practice. Sher Ali proposed that if Sadiq could not preach Islam in the United States, then "American missionaries should be expelled from India." Finally, Ali warned the United States that Islam would soon spread throughout the world, with or without its cooperation. After two months of confinement, Sadiq was finally allowed to enter the United States in April of 1920 on the condition that he would not preach polygamy.

Apparently the Ahmadis had not been aware up to that time of the discrimination against Muslim and Indian immigrants in the United States in the early 1900s. Before Sadiq's ordeal, many Muslim immigrants from the Middle East had already been refused entry by the immigration authorities at Ellis Island. An initial court decision that was eventually overruled said that they could not become citizens of the United States "because they were neither Caucasian nor African." This is important to our discussion because of the centrality of Indian racial identity to the Ahmadis' signification of Islamic identity-a signification that appealed to African-American converts in the 1920s.

The American press covered Sadiq's arrival in America with headlines such as "Picturesque Sadiq," "Hopes to Convert U.S.," "Speaks Seven Tongues," "Optimistic in Detention," and "East Indian Here with New Religion." Press, a Philadelphia newspaper, probably gave the most accurate account of Mufti Muhammad Sadiq's ordeal and his intentions in America:

> While many religious sects in the United States are spending many thousands of dollars and sending hundreds of philosophers and teachers to the wilds of Tibet, the far reaches of Arabia and Hindustan and to the unexplored regions of Africa and China, Mufti Muhammad Sadiq, after traveling thousands of miles, alone and friendless, hopes to begin his crusade to convert Americans to the doctrines taught by the

prophet Ahmad, of whom he is the principal disciple.

In the 1920s, New York had already acquired a reputation as a city of unparalleled opportunity for newcomers. The humorist Ogden Nash called it a city where "poor girls with nothing to their names but a letter or two can get rich and joyous," while Roi Ottley named it the "Black Mecca" because of its rich black culture and many job opportunities for African Americans. Perhaps Mufti Muhammad Sadiq was also attracted by New York's reputation when he decided to settle there after his release from detention in April 1920. He set up his headquarters on Madison Avenue, and he was moderately successful in the city. By the end of May, he had made twelve new converts to the Ahmadiyya movement-six from the Christian community and six from Islam. Two of these, Dr. George Baker and Ahmad Anderson, were among the first white Muslim converts in the United States in the early 1900's.

Sadiq missionized through lecturing and writing. By May 1920, he had contributed twenty articles on Islam to various American periodicals and newspapers, among them the New York Times. During his first year of missionary work in the United States, he delivered fifty public lectures on a variety of subjects in American cities, including Chicago, New York, Detroit, and Grand Havens, Michigan. Although Sadiq's outward style was quiet, unassuming, and almost passive, he was a confident lecturer, well suited for his role as preacher, writer, and public speaker for the Ahmadiyya movement in the United States. He had acquired valuable practical experience as a missionary in England, where the Ahmadis had been active since 1912. A learned man, he was a graduate of the University of London, a philologist of international repute, and an expert in Arabic and Hebrew whose work had been published in Philomath. Indeed, before Sadiq's departure for the United States in 1920, H. M. Leon, Secretary of the International Society of Philology, Sciences and Fine Arts, had presented the farewell speech at his going-away party in London.

Sadiq's missionary work for the Ahamadiyya Movement in Islam came from a deep spiritual commitment. He had been a close companion of Ghulam Ahmad, the founder of the movement, and believed that the latter had been "favored with the divine gift of prophecy." Mufti Sadiq also believed in the mystical power of dreams. While he was still in England, Sadiq had a dream about an American female convert. When S. W. Sobolewski walked into his headquarters in New York, he considered her the fulfillment of his dream. Sobolewski eventually converted to the Ahmadiyya movement, and Sadiq named her Fatima Mustafa. She was the first white American woman to join the religion.

Sadiq's most active female convert and proselytizer in New York, however, was Madame Rahatullah, an African American who, according to Sadiq, "secured one American convert and one Muslim to the Ahmadia order" in 1921. She also wrote a poem entitled "The Beauties of Islam" to express enthusiasm about her new faith.

THE AHMADDIYYA'S EFFORTS TO UNIFY BLACK AND NON-BLACK MUSLIMS

In October 1920, Sadiq moved the headquarters of the Ahmadiyya mission to Chicago because of its central location, which he claimed was more convenient for his work than New York. In this new location, he cultivated multi-racial relations with various communities of "white" Muslims. Illinois had attracted small but significant waves of Muslim immigrants from Syria, Lebanon, Jordan, and Palestine from 1875 to 1912 and from 1918 to 1922. These Arab Muslims, who came to the United States because of economic downturns in the Middle East, were mostly uneducated and worked as peddlers and industrial laborers. Their eagerness to escape the immigration restrictions of the 1920s and to achieve financial success led many of the later arrivals to assimilate and to change their Arabic names to American ones. It is important to note that with a few exceptions these white Muslims remained separate from black Muslims in America before the 1920s. Apparently, the former brought Islam's historic patterns of racial separatism to America from their old countries. Working against these separatist traditions, the Ahmadiyya movement struggled to bring

together Muslims of different racial and ethnic groups in the 1920s.

Some Arab immigrants, conservative Muslims or Sunnis, organized a community in Ross, North Dakota, in 1900; in 1920, they established a mosque there. Before 1914, approximately ten Lebanese Muslims worked at the Huskel Railroad Company in Michigan City, Indiana. In 1914, many Arab Muslims were attracted to the good pay at the Ford Highland Park Plant in Detroit, and they established a community in Highland Park. Two years later, employment at the Ford Rouge Plant provided impetus for the establishment of an Arab Muslim community in South Dearborn, Michigan. Muslim associations were established in Highland Park, Michigan, in 1919, and in Detroit in 1922. The Young Men's Muslim Association was founded in Brooklyn in 1923, and the Rose of Fraternity Lodge in Cedar Rapids, Iowa, in 1925. There was also a significant Sunni community in Toledo, Ohio. And the Shia immigrated to the United States around the same time.

Still more communities of Muslim immigrants had arrived from Eastern Europe during this period. They included Bosnian Muslims who came to the United States from Bosnia-Herzegovina, Yugoslavia, around 1900. These Muslim immigrants worked in the construction industry in Chicago and established their community on the Near North Side. Their social life focused on several coffee houses and a lodge, Dzemijetul Hajrije (Beneficiant Society), which was established in 1906. There were also smaller Bosnian Muslim communities in Gary, Indiana, and in Butte, Montana. Very small number of Turkish Muslims had immigrated to America between 1820 and 1860. And by the early 1900s, larger numbers of Turks had immigrated to the United States and settled in New York City, Chicago, Detroit, Philadelphia, and San Francisco. Most of these early Turkish Muslims maintained their language and their religious tradition in the United States. Albanian Muslims had settled in the United States by the early 1900s and established their first organization in Biddeford, Maine, in 1915. Finally, influenced by the Muslim immigrant community, by Muslim sailors from Yemen, Somalia, and Madagascar, and by the Ahmadiyya translation of the Quran, Shaykh Daoud Ahmed Faisal established an African-American Sunni group in New York City in 1924. His Islamic Mission of America, also called the State Street Mosque or Islamic Brotherhood, believed as the Moorish Science Temple did that black Americans "were not Negroes but were originally Muslims." Shayhk Daoud's groups spread Sunni practices among black Muslims on the East Coast in the 1920s and 1930s and continued to be significant to African-American Muslims for the remainder of the twentieth century.

Although the Ahmadis were heterodox, they maintained a civil relationship with these conservative Muslims in America in the 1920s. Mufti Muhammad Sadiq spoke Arabic and encouraged Arab nationalism as well as relations between Persians, Arabs, and Turks in America. He was highly respected by all Muslims in the United States in the 1920s.

In "My Advice to the Muhammadans in America," Sadiq mentioned that the thousands of Muslims in the United States came from many lands. However, he said, most of these people were "Muslims in name only" because Islam had ceased to play a practical role in their daily lives. Sadiq continued to say that the United States was a good country for millions of dispersed Muslims to settle in. To preserve their culture, however, they must (1) retain their Muslim names; (2) say their daily prayers; (3) read, write, and speak Arabic-the common language of Islam; (4) teach their children to be good Muslims; (5) donate the interest gained from their bank accounts to the propagation of Islam; (6) build mosques in every town; (7) promulgate Islam in America; and (8) join the Ahmadiyya movement.

In the fall of 1920, Sadiq collaborated with Mohni, the editor of the Arabic newspaper Alserat, to bring the orthodox and heterodox communities together to form a multi-racial society for the protection of Islam in the United States. Sadiq was elected president, and Mohni was elected the secretary of this society. Also, in that year, Sadiq moved the American headquarters of the Ahmadiyya movement to Highland Park, a suburb of Detroit. This was the

location of Karoub House, one of the first mosques in the United States, which was built at the cost of $55,000 by Hussain Karoub (a Syrian Muslim with real-estate holdings in Highland Park and Detroit), who became the imam of the mosque. Because Karoub House was utilized by Muslims from different ethnic groups, the building of this mosque inspired the Ahmadiyya movement in its efforts to link varied Muslim communities.

THE MOSLEM SUNRISE, THE "JIHAD OF WORDS," AND PROTESTANT RESISTANCE TO SADIQ'S MULTI-RACIAL MISSION

In July 1921, Mufti Muhammad Sadiq published the first issue of The Moslem Sunrise. The journal, which appeared every three months, was established for the primary purpose of refuting the misrepresentations of Islam that appeared in the American press. Indeed, this activity was one of the Ahmadis' most significant efforts for the American Muslim community. Thus, The Moslem Sunrise brought the Ahmadis' jihad of words to the forefront of Islamic identity in America. As we shall see, the jihad of words was destined to exercise a profound influence on the signification that black Americans formed for themselves in Islam. Plans for this publication had been in the works since October 1920. Significantly, the cover of each issue pictured a sunrise over North America, which symbolized the rising sun of Islam in the United States. Mirza Mahmud Ahmad, the leader of the Ahmadiyya Movement in Islam, compared the mission in the United States to that of the original American pioneers, and he called his missionaries in America "pioneers in the spiritual colonization of the western world." Multi-racial missionary work, then, would be a primary thrust of The Moslem Sunrise.

During the first quarter of the journal's publication, from July through October 1921, the movement received 646 communications and sent out 2,000 pieces of mail, including the journal. Five hundred letters about Islam were mailed to Masonic lodges in the United States, along with copies of The Moslem Sunrise. Also, one thousand pieces of Ahmadi literature were sent to major libraries in the United States. The Ahmadiyya movement also mailed literature to many celebrities in the United States and abroad, among them Thomas Edison, Henry Ford, and President Warren Harding. These efforts resulted in thirty-one new converts during this period.

Several articles published in The Moslem Sunrise during 1921 defended Islam against erroneous information published by the American press. The New York Herald, for instance, had criticized the Quran for teaching Muslims "to hate and kill unbelievers." And several newspaper articles criticized Islam in light of the Turkish atrocities in Europe, since the Greek Christians were fighting against the Turks in the early 1920s. Convinced that American Christians were threatened by the infidel, editors of the Syracuse Sunday Herald took note:

> To the millions of American Christians who have so long looked eagerly forward to the time the cross shall be supreme in every land and the people of the whole world shall have become followers of Christ, the plan to win this continent to the path of the "infidel Turk" will seem a thing unbelievable. But there is no doubt about its being pressed with all the fanatical zeal for which the Mohammedans are noted.

Ever alert to attacks on or gross misrepresentations of Islam, Sadiq exposed the biases of such stories, citing the programs in the Ukraine in which Christians had killed 140,000 Jews from February to June of 1921. Europeans and Americans should show as much concern for this massacre, he pointed out, as for the one perpetrated against the Armenians by the Turks. Finally, Sadiq defended Islam by citing the race problem in the United States and the multi-racial agenda of global Islam:

> What sad news we came across . .. about the conflict between the Blacks and the Whites in this country. It is a pity that no preaching of equality or Christian charity has so

far been able to do away with this evil. In the East we never hear of such things occurring between the peoples. There are people fairer than North Europeans living friendly and amiably with those of the darkest skin in India, Arabia and other Asiatic and African countries .... In Islam no church has ever had seats reserved for anybody and if a Negro enters first and takes the front seat even the Sultan if he happens to come after him never thinks of removing him from the seat.

It is noteworthy that Sadiq's view of equality in Islam did not reconcile with the history of racism in the Muslim world. However, the Indian missionary's idealized view of his religion was not unusual, since few Muslims have dealt critically with the issue of racism in Islam.

In another article, Sadiq commented on his exclusion from preaching in Detroit churches:

> If the Detroit churches are not open for me to preach in I do not care a bit. No Moslem here cares to see me preaching the churches. Moreover the churches are not suitably furnished for our services. My challenge was to the broadmindedness of the Christian pastors in comparison with that shown by our Holy Prophet. I was sure that the Christian "Love your enemies" was only to preach and not to practice. But I wanted to get it out of their mouths and I have got it.

Sadiq's indictment of racism in the churches also led him finally to express his bitterness about his ordeal with the immigration authorities. Rhetorically asking what would happen "if Jesus Christ comes to America and applies for admission to the United States under the immigration laws," Sadiq answered that the immigration authorities would decide "that Jesus would not be allowed to enter this country because (1) he comes from a land which is out of the permitted zone; (2) he has no money with him; (3) he is not decently dressed; (4) he has no credentials to show that he is an authorized preacher."

By the second year of its mission in the United States, then, the Ahmadiyya movement had developed an adversarial relationship with the American media and with mainstream Christianity. Moreover, Mufti Muhammad Sadiq's negative experiences with the immigration authorities, the white Protestant churches, and the media had resulted in some significant changes in his personality and his attitude toward America. By 1921, he was no longer a humble saintly martyr, but instead a bitter and angry opponent of white mainstream Christianity and racism in America. He had been fooled by the United States' outward image as a place of freedom and equality, in a decade when both Protestant and Catholic churches "failed largely to abandon racism either at the altar or through their secular policies."

The history of the Ahmadiyya movement reveals much about American religion during the early twentieth century, particularly the relationship between its Protestant center and those traditions outside it. Obviously, the"assimilationist" or "the melting pot" model in American history did not include the Ahmadis, for these Muslims were ultimately unwilling to abandon their old culture to embrace the new. Hardened by their encounters with racism, and by the contrast between their experience and that of other immigrant groups, they were intent on transforming the host culture by conversion to a multi-racial version of Islam and the signification of Indian cultural identity, not on being assimilated into it.

Originally, Mufti Muhammad Sadiq had envisioned an ecumenical movement of multi-racial cooperation and increased understanding between Protestants and Muslims in America. If this movement had succeeded, it could have resulted in partial acculturation along class lines rather than the complete alienation of American Muslims in the 1920s. After all, Sadiq was well-educated and had been accepted in middle-and upper-class circles in England. However, as we have seen, most white Protestants were unwilling to work toward an ecumenical multi-

racial goal because of their racism and their deeply entrenched fear of Islam. As C. Eric Lincoln put it, "Being 'American' presupposes the Judeo-Christian heritage of experience ... and the religion of Islam is not in any substantial way a part of the critically valued American experience."

As it became clear that the negative tensions with the host society were irresolvable, the Ahmadis began to focus their conversion efforts in the United States less on white people and more on blacks. For a short time, this new racial emphasis led to a new vision of a global Pan-Islamic alliance in which Indian nationalism and Pan-Africanism were linked in a potent multi-racial synthesis of anti-imperialist and anti-Christian religious and political ideas.

A MULTI-RACIAL MISSION TO BLACK AMERICA

" Asalaam Alaikum!" said Mufti Muhammad Sadiq, as he surveyed the small group of mostly black and brown worshippers gathered at the mosque on Wabash Avenue in Chicago. A young and strong-looking Russian man with fair skin and sandy hair stood out in the audience this Sunday evening in August 1922. He was seated next to a strikingly handsome Indian from Calcutta, a dental student at the State University in Iowa. Sadiq folded his arms across his green full-length jacket with a military collar and a scarlet-colored lining, as a black man named Abdul Hakeem sang "Allah Be Praised" in a rich baritone voice. Mufti Muhammad Sadiq's skullcap, his large, clear brown eyes, and his prominent nose gave him the appearance of a "brown skinned Jew," while his white mustache, sideburns, and flowing beard gave him a "gospel likeness." He looked and spoke like a biblical prophet, and this was an important aspect of the appeal of Sadiq's exotic Indian identity to his black American followers. Carefully he closed his leather-bound Quran and began his sermon:

> " There is but one God," he said. "All others are mere prophets, including Jesus. Muhammad was the last and the equal of the others. None is to be worshiped, not even Jesus or Muhammad. The Trinity is an illusion-the word is not found in the Christian Bible and its principle cannot be sustained. God created a II races, all colors. Islam makes no difference between race and class." At the end of the service, worshippers rehearsed their new Arabic names and Sadiq blessed them: "Bismillah in the name of Allah."

From 1921 to 1925, the Ahmadis made 1,025 American converts whose names and places of residence were listed in the pages of The Moslem Sunrise.67 Many of the Ahmadiyya converts were black residents of Chicago and Detroit. These two cities, and to a lesser extent, Gary, Indiana, and St. Louis, Missouri, were hotbeds of Ahmadiyya activity in the 1920s. In 1922, Sadiq moved the American headquarters of the movement from Highland Park, Michigan, to Wabash Avenue on the south side of Chicago. A converted house served as a mosque and mission house from which The Moslem Sunrise was published. Outside, the Ahmadis erected a small dome or minaret to signal their commitments. Much of the financing for the mosque came from donations from Ahmadis in India.68 Muhammad Yaqoob (Andrew Jacob), Ghulam Rasul (Mrs. Elias Russel), and James Sodick-a Russian Tartar-were key figures in the Ahmadiyya work in Chicago in the 1920s.

Meanwhile, Sadiq continued to deliver lectures throughout the mid western and eastern sections of the United States. Most of these lectures, which were delivered at schools, civic clubs, and lodges, were well received. For example, Sadiq noted with regard to a trip to Minnesota:

> In Crookston, Minnesota, I was invited by the superintendent of the State Farm School to give a talk on Islam in the school hall. I spoke for an hour ... and the chairman thanking me for the speech said: "All I knew of Muhammadanism before this was that the Muhammadans

worship Muhammad and kill the Christians, but today I have learned the real facts and I am thankful for it."

Although these lecture trips resulted in several new white converts for the Ahmadiyya movement, news of African-American converts continued to dominate the pages of The Moslem Sunrise. Several of these African Americans became prominent missionaries for the Ahmadiyya movement after their conversion. In 1922, The Moslem Sunrise first featured a picture and a short report about a recent black convert, Sheik Ahmad Din (P. Nathaniel Johnson), "a zealous worker for Islam," who had just been appointed as a missionary in St. Louis, Missouri?! Here Ahmad Din led a group of devout Muslims that included blacks, Turks, and a small number of whites. In one of his pictures he wore a fez, which suggests that Din may have been a Freemason or a former member of Noble Drew Ali's Moorish Science Temple movement.

An article about Din in the St. Louis Post Dispatch reports that he had acquired one hundred converts during the first six months of his mission in St. Louis,? Another black convert-Brother Omar (William M. Patton) of the Lamarsary Shop-was also cited for his proselytizing efforts in St. Louis/4 and Sister Noor (Ophelia Avant) was one of the most enthusiastic black female converts in the St. Louis area.

Photographs of four other black women-Sister Khairat (Thomas), Sister Zeineb (Watts), Sister Ahmadea (Robinson), and Sister Ayesha (Clark)-were also featured in The Moslem Sunrise. It is noteworthy that all of these women wore traditional Muslim veils to cover their faces, and long dresses and long sleeves to cover their bodies. New clothing was a significant aspect of the conversion experience for these blacks. Although conversion was not a new phenomenon in African-American culture and African Americans had experienced "profoundly emotional new births" in the context of evangelical Protestantism since the eighteenth century Muslim clothing and Arabic names added a new dimension to this experience. The new clothes-veils, long dresses, skullcaps, turbans, fezzes, and robes, like the shad belly coats and the dove-colored bonnets of the nineteenth-century Quakers-differentiated the Muslims from their Christian neighbors and signaled their new religious commitment. For some of the black Muslims, the new clothes were undoubtedly a symbol of alienation and ethnic differentiation from the mainstream white culture. For others, they were probably a medium of creative, artistic expression. The converts' new Arabic names could be understood in the same way. Indeed a subtle interface between creative stylistic expression and genuine religious motivation might have attracted some blacks to the symbols of American Islam in the 1920s. Such cultural exchanges exemplify the black community's concern with signifying and identifying themselves as distinct from white culture.

Some of the black converts to the Ahmadiyya movement were Protestant ministers who were probably drawn to a multi-racial religious community with new opportunities for leadership not available in segregated evangelical Protestant contexts. For example, Brother Hakim (Dr. J. H. Humphries) came to the United States from the Congo Free State (the Belgian Congo) at the age of seventeen. He studied for the ministry at Tuskegee Institute for five years, after which he was ordained and became a Christian missionary. After listening to one of Sheik Ahmad Din's lectures on Islam, Hakim became disillusioned with Christianity and converted to Islam. Soon he was a zealous missionary for the Ahmadiyya movement, and was thought to possess extraordinary healing powers.78 He was a tall, handsome, distinguished-looking man, whom Ahmad Din praised without reservation, calling him a man of “great spiritual powers" and a "magnetic healer of extraordinary ability."

Brother Hakim and Ahmad Din-articulate, well-educated, and middle-class-were well-suited for Mufti Muhammad Sadiq's sophisticated style of instruction in Islam. Much of the instruction occurred through public lectures. Other media included the Ahmadiyya Public Library. The Moslem Sunrise featured detailed articles on the writing and pronunciation of the Arabic language and the performance of

salad-the Muslim mode of worship. There were also many articles on Islamic history and on the progress of Ahmadiyya missions in Europe, Africa, and Asia. After their instruction, all new converts to the Ahmadiyya movement signed the "Bismillah," signifying their commitment to a new religion that involved the particular beliefs and duties of Islam.

Although the Ahmadiyya Movement in Islam secured some white American converts, there were few white American proselytizers in the early 1920s. Because of the leadership roles that it gave to its black participants, however, the movement began to attract members of the Universal Negro Improvement Association. Brother Abdullah (James Conwell), a prominent convert in Chicago, was a Garveyite. There were at least six other Garveyites in the Chicago mission, and they wore their Garvey uniforms to the Ahmadi religious services and meetings. In 1923, Sadiq gave five lectures at the UNIA meetings in Detroit. Eventually he converted forty Garveyites to Islam. "Out of the converts there, an intelligent and enthusiastic young man, Rev. Sutton, has been appointed as the leader of the congregation with his Moslem name as Sheik Abdus Salaam," he wrote. "Another zealous member of ours is Mrs. Wright (Sister Nazeefa), who together with her little children is studiously learning the Arabic language."

Thus there was a direct relationship between the Universal Negro Improvement Association and the Ahmadiyya Movement in Islam. But the connection between the two groups occurred on a more subtle level as well, a fact that is significant to African-American religious history and that suggests a main concern here. The Ahmadis were Indians-one of the "darker races of the world"-who were seeking their independence from the British. The Garvey movement stressed the internationalist perspective that led African Americans to think of themselves in concert with Africans and the “darker races of the world" against white Europeans and Americans. In the 1920s, this internationalist identity, which had been growing among blacks since the late nineteenth century, began to extend to their religious consciousness as well. Christianity was increasingly criticized as a "clan religion" for whites that needed to be revised by blacks or abandoned for another religion, such as Islam. The attraction of both the Garvey movement and the Ahmadiyya Movement in lslam was that they offered a new religious identity to African Americans who had been awakened to this perspective. Just as the UNIA was the Universal Negro Improvement Association with universality in the political sphere, the Ahmadis connected the faithful to a worldwide, multi-racial, but "nonwhite" religion.

Moreover, as we have seen, Garveyism and the Islamic movements in the 1920s were forms of political religion. David Apter has argued that, especially in Third World nations, the sacred is used to legitimate political ends and to mobilize the community for political goals. In this context, political doctrine becomes "in effect, a political religion" which gives “continuity, meaning and purpose" to a people's life.82 With this perspective in mind, one could say there were three historical strands in the development of Islam in the United States in the 1920s. The first, the conservative Sunni Islam of the Muslim immigrants from the Middle East and the Islamic Mission of America, were orthodox, universalist, and also politically conservative. The second, the Moorish Science Temple movement, was heterodox, a racial-separatist interpretation of Islam, and Pan-Africanist with a "Moroccan" cultural base. Third, and important here, the Ahmadiyya Movement in Islam was heterodox, multi-racial, and politically mixed-the Ahmadis were advocates of both Pan-Islam and Indian nationalism. Ahmadis knew that the Garvey movement was sympathetic to both of these issues; they saw the parallels between the two movements and Pan-Africanism; and to a certain extent they identified with black people as fellow victims of European colonization and imperialism.

Pan-Islam was not a new issue for Marcus Garvey or for the UNIA. In Chapter 3, we examined Garvey's relationship with Duse Mohammed Ali, the Egyptian journalist who was also an advocate of this principle, as well as of Egyptian nationalism and Pan-African business ventures. He may have influenced Garvey to allow Sadiq to give the aforementioned lectures at the UNIA meeting in Detroit in

1923.83

Some people in the UNIA were undoubtedly familiar with the issue of Indian nationalism prior to any contact with the Ahmadis. On February 11, 1922, Ganesh Rao sent a letter to the editor of the Negro World, which dealt with this issue in the context of the internationalist perspective:

> I am sailing from that distant charming land of perpetual sunshine-India. I am one of those millions that are being oppressed by the imperialistic English government. My interest, my responsibility, my duty, has thus impelled me to study the tragic tales of other oppressed peoples, e.g., the Negro, and his future. From my humble study so far I have confidently felt that the UNIA is doing the real work for the uplift of the Negro, and the U stands for, in word as in action-Universal. ... India is in her birth-throes; she soon shall be free. Ethiopia, self conscious, is working for her independent and unhindered progress. Peace shall not dawn on this world until Asia and Africa and their ancient peoples are free and enjoy all human rights. Oppressed peoples of the world, unite. Lose no time!

In this context, in 1923 some of Sadiq's articles in The Moslem Sunrise took on a new militant internationalist tone, suggesting that Islam and the Arabic language could facilitate the primary political goal of Garveyism, the worldwide unification of all people of African descent. The basic message here was that Islam could be used to legitimize the internationalist perspective-a political end-and to mobilize the Garveyites and other African Americans for this political goal. In this situation Islam would, in effect, function as "political religion." Sadiq's article "Crescent or Cross?" was addressed specifically to the UNIA and indicated that Sadiq was no longer concealing his anger and bitterness toward Christianity and the Western world. He suggested that Garvey expand his motto of "One God, One Aim, One Destiny" to include "One language which would be Arabic." Finally, Sadiq mentioned that "all the white powers fear Mohammedanism" and that black people could find millions of "valuable [multiracial] allies" among the Muslims in China, Arabia, Afghanistan, Turkey, Persia, and India.

This militant internationalist tone continued in another short piece.

> My Dear American Negro . . . the Christian profiteers brought you out of your native lands of Africa and in Christianizing you made you forsake the religion and language of your forefathers-which were Islam and Arabic. You have experienced Christianity for so many years and it has proved to be no good. It is a failure. Christianity cannot bring real brotherhood to the nations. Now leave it alone. And join Islam, the real faith of Universal Brotherhood which at once does away with all distinctions of race, color and creed.

The Nation of Islam used this kind of propaganda, which raised issues of signification and identity, to attract thousands of black converts in the 1930s. Such propaganda aimed to instill bitter resentment toward the white race that would result in complete rejection of Christianity and white culture. Black people influenced by this propaganda often converted to Islam, which they believed was the religion of their ancestors before slavery. Apparently through their connection with Garvey's global Pan-Africanist perspective, the Ahmadis had begun to acquire a keen understanding of the psychology of the ordinary black person that enabled them to connect Islam with Pan-Africanism and race pride and to create programs that they believed reflected the real situation of black people in America in the 1920s. At the same time, although the Ahmadiyya movement was indigenous to India, it had missions in Nigeria, Ghana, and the Ivory Coast in the 1920s. Thus, its global perspective was as expansive as Garvey's and almost as radical in its strategies for the

liberation of people of color.

Garveyism and the internationalist perspective, however, were of no interest to the Ahmadiyya Movement in Islam during the years of the UNIA's decline. Unfortunately, we do not know how the Ahmadiyya movement reacted to Garvey's downfall. The Moslem Sunrise suspended publication from 1924 to 1930-the years of Garvey's trial, imprisonment, and deportation-probably due to financial difficulties. Also, since the Ahmadis had drawn some of their American converts and leaders from the ranks of the UNIA, it is probable that there was a shortage of new members and of vital services. Perhaps the Ahmadiyya movement saw the handwriting on the wall-that the mid-1920s saw the suppression of radicalism in the United States and that foreign leaders of radical movements were in particular danger of deportation. Garvey's ordeal was a lesson for all alien leaders in the 1920s.

In September 1923, Mufti Muhammad Sadiq concluded his work in America and returned to India, where he was reunited with his wife and children after years of separation. His successor, Maulvi Muhammad Din, had been headmaster of a high school in India and editor of the Ahmadi journal The Review of Religions. A few months before his departure, Sadiq enthusiastically presented Din to the readers of The Moslem Sunrise. He wrote:

He has been living at the headquarters of the Ahmadia movement and studying and practicing the sacred knowledge under the direction of the Promised Messiah and his successors for more than twenty years.

During his three years in America, Mufti Muhammad Sadiq converted over seven hundred Americans to Islam. His impact on American religion during this period, however, cannot be adequately measured by numbers: he provided the first model of multi-racial community experience for African-American Muslims, and the Ahmadiyya community published the first Muslim newspaper and the first Quran in English in America and most of the Islamic literature that would be available to African American Muslims until the 1960s. Although Sadiq's bitter personal experiences in the United States led him to place the Muslim community in a defensive and alienated position, he was still determined to make Islam a permanent part of the American cultural fabric. In spite of his antipathy for "the West," Sadiq's independent spirit, his original ecumenical goal, his boundless energy, his appetite for new endeavors, his fierce pursuit of success, and his passion for social justice were also American qualities.

Vol 2, No 1—july 2015
A L M A N A R
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA